پیپر

April, 1969

# ماہنامہ جاں نثار امرتسر

## غالب نمبر

مدیر اعلیٰ اعزازی
میلا رام وفا

مدیر
رام لال نبھنداری

مدیر (اعزازی)
مہندر باوا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
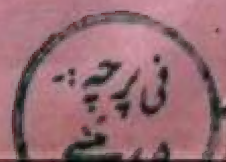
فی پرچہ

منظور شدہ از محکمہ تعلیمات پنجاب بذریعہ چٹھی نمبر (ای پی بی ۶۷-۲۱۳۱) چنڈی گڑھ ۳۰ مئی ۱۹۶۷ء
ماہنامہ
جاں نثار
امرتسر
غالب نمبر
مرزا اسد اللہ خاں غالب
اپریل ۱۹۶۹ء
جلد نمبر ۴ نمبر ۴
مدیر اعلیٰ (اعزازی)
میلا رام وفا
مدیر:-
رام لال بھنڈاری
مدیر (اعزازی)
مہندر باوا
قیمت فی پرچہ :- ۵۰ پیسے
سالانہ چندہ:- دس روپے
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے ۔ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور
مقام اشاعت:- ۶۸ سبھاش نگر کٹڑہ شیر سنگھ امرت سر
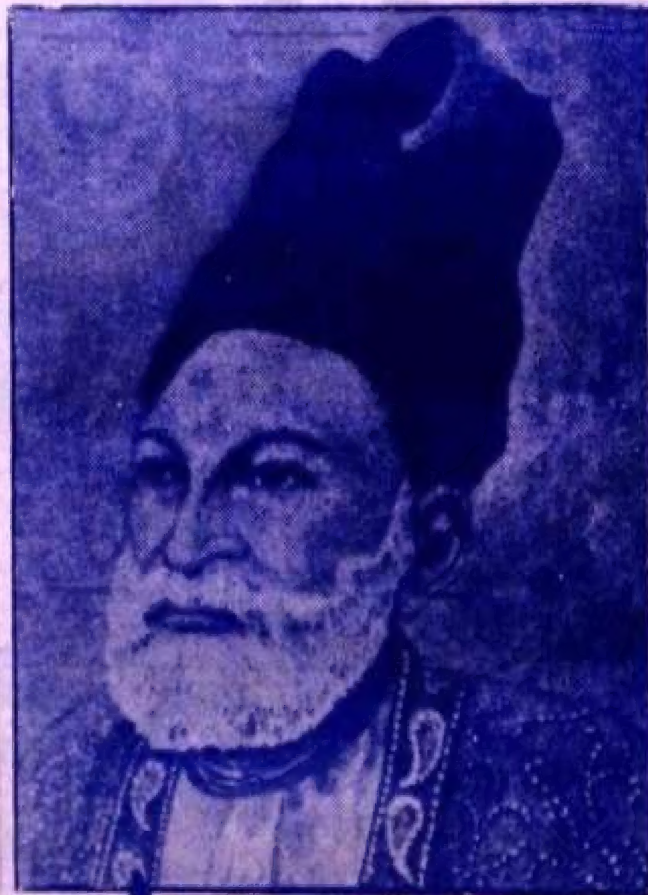
# ترتیب



رام لال بھنڈاری پرنٹر، پبلشر۔ ایڈیٹر اور پروپرائٹر نے ۶۸ ٹائٹل کے صفحات یونیکو پریس چوک فوارہ امرتسر سے، ٹائیٹل کے صفحات پارس پریس سنٹرل ٹاؤن جالندھر اور متن کے صفحات چوپڑہ پرنٹنگ پریس باغ کرم بخش جالندھر سے چھپوا کر دفتر جان نثار، پرکاش نگر، نزد شیر سنگھ گیٹ امرتسر سے ۱۲ اپریل ۱۹۶۹ء کو شائع کیا۔

# پیغامات

## اکابرینِ ملک کا اظہارِ عقیدت

**مسز اندرا گاندھی وزیراعظم ہند۔**

مرزا غالب ہمارے ادب کی لافانی شخصیتوں میں سے ہیں۔ وہ ایک بڑے پر آشوب دور کی یادگار ہیں۔ ان کے کلام میں زندگی سے محبت اور زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کے وجدان اور ذہنی کرب نے ایک ایسی شاعری کی تخلیق کی ہے۔ جو وسیع ترین گنگا کے میدانوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کا حصہ بن گئی ہے۔ ان کے حسین اشعار بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ ایک شاعر کی عظمت کو اس سے بڑھ کر کیا خراجِ عقیدت ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے کلام نے ایک دور کے کلچر کو ڈھالنے کا کام کیا ہے۔

**سردار گورنام سنگھ وزیر اعلیٰ پنجاب۔**

میں نوں ایہہ دسن کے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ تہاڈا رسالہ "جان نثار" بھی ہی غالب نمبر کڈھ رہا ہے۔

مرزا غالب اِک اُچ کوٹی دے شاعر سن۔ اوہناں نے رنگیلے بھارت وچ سگوں ڈونگھے ولیشاں توں وی اپنے کم دی شلاگھا پراپت کیتی۔

میں تہانوں اِس اُدّم اُتے ودھائی دیندا ہاں۔

دستخط:۔ گورنام سنگھ (مکھ منتری پنجاب)

**جناب فخرالدین علی احمد وزیر انڈسٹری ڈیولپمنٹ بھارت سرکار۔**

مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی ہے کہ ماہنامہ "جان نثار" امرت سر اپنا غالب نمبر شائع کرنے جا رہا ہے۔ غالب اردو کا محبوب ترین اور مقبول ترین شاعر ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان میں غالب کے خطوط ادکا دیزی میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ جن میں غالب نے اپنے طرزِ بیان سے ایک لافانی حسن پیدا کر دیا ہے۔ جو اُن کے وسیع قوتِ مشاہدہ اور اعلیٰ نگاہِ انتخاب کا پتہ دیتی ہے۔ یہ غالب کے قلم کا ہی کمال تھا۔ کہ معمولی معمولی باتوں کو اتنا دلچسپ اندازِ بیان عطا کیا اور چھوٹی سی بات کو عجیبی شان دے دی۔ بارش کا حال لکھا تو ہماری نظروں میں طوفانی موسم کا ایک نقشہ کھینچ گیا۔ گھر کا حال تحریر کیا تو شکستگی اور تباہی کا ایک منظر سامنے آ گیا۔ جاڑوں میں شراب کی بات کی تو ذہن پر نشہ چھا گیا۔ غالب کی تحریر کسی ادبی اصول کی پابند نہیں تھی۔ یہ طبع زاد اور خود اُن کی اُپج تھی۔ جو دیکھنے میں آسان لیکن اپنانے میں مشکل۔ پڑھنے میں شیریں اور لکھنے میں کٹھن۔ غالب نکتہ ور بھی تھے۔ اور نکتہ سنج بھی۔ نکتہ نواز بھی تھے۔ اور نکتہ آفریں بھی۔ اس وجہ سے غالب جہاں عظیم شاعر تھے۔ وہاں بے نظیر نثار بھی تھے۔

فروری میں مرکزی سنٹیزی کمیٹی کی جانب سے غالب کی صد سالہ برسی منانے کے سلسلہ میں تقاریب دہلی میں ہوئیں۔ جن میں بیرونی ممالک سے بھی علماء نے شرکت کی۔ یہ غالب کی عظمت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ جو دنیا غالب کی عظمت کی قائل ہو گئی۔ تو اس کی زبان کو بھی بقائے دوامی مل سکے گی۔

دستخط:۔ فخرالدین علی احمد

**ڈی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ منسٹر ٹرانسپورٹ۔ ہند سرکار**

غالب بہت ذہین اور حساس تھے۔ انہی خوبیوں نے انہیں ایک عظیم شاعر بنایا۔ اُن کی شاعری ہمیں یہ پیغام دیتی ہے، کہ زندگی اپنی کمیوں اور خامیوں کے باوجود خوبصورت اور عالی نمود ہے

## سردار گوردیال سنگھ ڈھلوں ممبر پارلیمنٹ

یہ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ ماہنامہ "جان نثار" ماہ اپریل میں "غالب نمبر" شائع کر رہا ہے۔ غالب نہ صرف شاعر تھے۔ بلکہ ایک انسٹی ٹیوشن تھے۔ انہوں نے تنگنائے غزل کو گل و بلبل کے افسانوں کے دلدل سے نکال کر بلند پایہ افکار کے گل و گلزار سے روشناس کیا۔ اردو زبان کو نیا لوچ عطا کیا۔ اور دنیا کو انسان دوستی، محبت اور صلح و آشتی کا درس دیا۔ حکومت ہند نے غالب کی برسی منا کر اپنا حق ادا کیا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے۔ کہ غالب کے کلام اور ان کے خطوط کو ہندوستان کی دوسری زبانوں میں شائع کرنے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے خیالات سے مستفید ہو سکیں۔

(دستخط) گوردیال سنگھ ڈھلوں
(ممبر پارلیمنٹ)

## گیانی گورمکھ سنگھ مسافر ممبر پارلیمنٹ

مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی ہے۔ کہ موقر ماہنامہ "جان نثار" امرتسر غالب نمبر شائع کر رہا ہے۔ مرزا غالب کا مقام اردو ادب میں بہت بلند ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کی صد سالہ برسی ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی بڑی دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے۔ غالب نے اپنی تخلیقات نظم و نثر کے ذریعے اعلیٰ انسانی قدروں کا پرچار کیا اور اس دنیا کو انسان دوستی اور رواداری کا سبق دیا۔ ہر چند غالب نے صرف غزل ہی کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور گل و بلبل، شمع و پروانہ، طائر و قفس اور بادہ و ساغر کی روایتی علامات و اصطلاحات کا استعمال کیا مگر ان کی تخیل کی پرواز مذہبی نہ تھی۔ وہ ان کی اپنی تھی۔ انہوں نے ان فرسودہ علامات کو نیا معنی بخشا۔ الفاظ کے ذریعہ دقیق مسائل تصوف کا حل اور آفاقی فلسفہ حیات پیش کیا۔ غالب کا نام اور اس کی زبان رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔

(دستخط) گورمکھ سنگھ مسافر
ممبر پارلیمنٹ

ایم۔ ایل بھاردواج ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر حکومت ہند،

غالب ہمارا عظیم قومی شاعر ہے۔ اس کی نظم اور نثر دونوں ہی ہمارے عزیز اور مشترک قومی ورثے کی اہم یادگاریں ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ غالب کا کلام کئی ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس پر فارسی اور اردو ہی کا نہیں۔ بلکہ ہر اس زبان کا حق ہے۔ جس میں محبت کے نغمے گائے اور ادبی اقدار کے زمزمے سنائے جاتے ہیں۔ غالب کے کلام پر ایک صدی سے زیادہ زمانہ بیت گیا۔ لیکن ہر نسل اور ہر قوم کو اس میں اپنے ہی دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

غالب کی زندگی بھی اس کے کلام ہی کی طرح تمام رسوم و قیود سے بالاتر مگر سچی ہندوستانیت کی آئینہ دار تھی۔ غالب یکجہتی اور ہم آہنگی کا پیامبر ہے۔ اور اس کے یہاں رواداری و عقیدت کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

ہم لوگ جو صحافتی دنیا سے وابستہ رہے ہیں، غالب کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتے۔ کہ اس نے اردو نثر کو آسان سلیس اور بول چال کی زبان کے قریب کیا۔ اور اسے درجہ توانائی اور دلفریبی عطا کی۔

میں اس یادگاری موقع پر پوری صحافتی برادری کی طرف سے اور غالب کے [illegible] اور سخن فہموں کی طرف سے ہدیۂ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

* * *

شری بلراج مدھوک ممبر پارلیمنٹ [illegible]

مرزا غالب ہمارے دیش کے ایک مہان کوی تھے۔ میں ان کے پرتی اپنی شردھانجلی بھینٹ کرتا ہوں۔

امیر بیٹوریلے

# مرزا غالب

آبِ حیات کے مصنف شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے اردو شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ولی دکنی۔ شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون اور سید محمد شاکر ناجی کا تھا۔ دوسرا شاہ حاتم، خان سراج الدین علی خاں آرزو۔ خان اشرف علی خاں فغاں، شاہ تسلیم اور میاں ہدایت کا۔ تیسرا مرزا جان جاناں مظہر، میر عبدالحی تاباں۔ مرزا محمد رفیع سودا۔ مرزا فاخر مکیں، خواجہ میر درد۔ میر ضاحک۔ خواجہ میر اثر۔ میر سوز اور میر تقی میر کا۔ چوتھا جرأت۔ انشا۔ مصحفی اور میر حسن کا اور پانچواں ناسخ۔ آتش۔ مومن۔ ذوق۔ غالب۔ دبیر اور انیس کا۔

لیکن زبان کی صفائی اور بیان کی سلاست نیز زورِ کلام، حسنِ ادا، تاثیرِ شعر اور پروازِ خیال کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو پہلے چار ادوار کو ایک ہی دور تصور کیا جا سکتا ہے۔ میر تقی میر کے نشتروں۔ خواجہ میر درد کے کچھ تصوف آموز اشعار اور سید انشا کی اس غزل کو چھوڑ کر جس کا مطلع ہے۔ ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اس دور کی شاعری بالعموم ایسے کلام پر مشتمل ہے جس میں شعریت درد و داخلی اور قوتِ بیان کی بجائے صنائع و بدائع اور رعایتِ لفظی کی جھلک زیادہ نمایاں ہے۔ مثنوی میر حسن اور دو سوخت امانت کو پڑھتے ہوئے بھی بعض مقامات پر زبان سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ مگر باقی شاعری میں ایسے اشعار خال خال بھی مشکل ہی نظر آتے ہیں۔ جیسے جرأت کا سراپا فصاحت و مجسم بلاغت یہ شعر ؎

کبھی اس سے بات کرنا۔ کبھی اُس سے بات کرنا
ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا

یا خواجہ میر درد کے بھائی خواجہ میر اثر کا یہ دلگداز شعر ؎

دن کٹا جس طرح کٹا لیکن
رات کٹتی نظر نہیں آتی

مرزا محمد رفیع سودا اپنے عہد کے ملک الشعرا تھے۔ صاحب آبِ حیات نے اُن کے اس شعر کو بہت اُچھالا ہے۔ ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

لیکن اسی زمین میں اور انہی قافیوں میں عہدِ رواں کے مایۂ ناز شاعر مرزا یاس یگانہ کا یہ شعر ؎

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

سودا کے شعر سے بمراتب بلند اور بمدارج دلآویز ہے اور فرسنگوں آگے نکل گیا ہے۔

اس بحث کی روشنی میں وہ دور جسے شمس العلما آزاد نے اردو شاعری کے پانچویں دور کا نام دیا ہے۔ دراصل دوسرے دور یا دورِ حاضر کے آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسے یہ حیثیت عملی طور پر اور زیادہ تر مرزا غالب کی بدولت حاصل ہوئی۔ مرزا غالب طبعاً جدت پسند تھے۔ اور شاعری میں عام روش پر چلنا انہیں منظور نہ تھا۔ انہوں نے اندازِ بیاں میں گوناگوں جدتیں پیدا کیں۔ ان کا طریقۂ شعرگوئی ہمعصر شعرا سے جداگانہ بھی تھا۔ اور بعد جہا زیادہ دل پذیر بھی۔ جدت آفرینی کے ساتھ ساتھ زبان کی صفائی۔ بیان کی روانی۔ الفاظ کی برجستگی اور الفاظ و مضامین کی

ہم آہنگی کے معاملہ میں بھی وُہ اپنا جواب آپ ہی تھے۔ تنقید کا عیب جس سے ان کے پیش رووں اور معاصرین کا کلام بھرا پڑا ہے۔ کلامِ غالب میں ایک آدھ شعر کے سوا کہیں نظر نہیں آتا۔

مرزا غالب کی شاعری کے جو اوصاف اُوپر بیان کئے گئے ہیں۔ وُہ ان کی اکثر غزلوں میں اوّل سے آخر تک ہر شعر میں پائے جاتے ہیں۔ بطور نمونہ ذیل کی غزل ملاحظہ ہو۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچے کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے؟ اگر اعتبار ہوتا۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تُو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

امر مسلّمہ یہ ہے کہ اس غزل کا جواب اُردو کا کوئی شاعر آج تک پیش نہیں کر سکا۔ مرزا داغ جیسا قادر الکلام اور مقبولِ خاص و عام اور سخن طراز بھی غالب کی گرد کو نہ پا سکا۔ اور اس زمین میں کچھ یُوں سے اشعار ہی نکال سکا۔

عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا؟
تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا؟

داغ کے ہمعصر اور حریف امیر مینائی نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی کی۔ مگر داغ کی طرح ناکام ہی رہا۔ اس ضمن میں مرزا غالب کی دو اور غزلیں درج ذیل ہیں۔

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

*

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہُوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ایسی ہی سرتاپا مرصع غزلیں کلامِ غالب میں اور بھی بہت ہیں۔ جو بیان کی ندرت اور شگفتگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ مگر طوالت کے خوف سے انہیں مضمون میں پیش کرنا مشکل ہے۔ تاہم کچھ متفرق اشعار ذیل میں درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے شعراء کے مقابلہ میں غالب کی امتیازی حیثیت کیا ہے۔ ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

*

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

*

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

*

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

*

شب تم جو بزمِ ناز میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

*

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

*

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

*

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

*

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اسکی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

*

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

*

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

*

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

*

بجز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
بجز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
یہ دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مندرجہ بالا سالم کی سالم غزلیں اور متفرق اشعار اس دعوے کا منہ بولتا ثبوت ہیں، کہ جہاں تک زبان کی سلاست و صفائی اور بیان کی شگفتگی و برجستگی کا تعلق ہے۔ غالب نہ صرف اپنے پیشروؤں پر فائق ہے۔ بلکہ اپنے معاصرین سے بھی بہت آگے ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے، کہ یہ اندازِ بیان کا جسے غالب کے بعد آنے والے شعراء نے عمومیت کے ساتھ اختیار کر لیا غالب کی ایجاد ہے۔ شعر کو مترنم الفاظ کا لباس پہنانے اور اسے شعریت مجسم بنانے میں غالب ان سب پر غالب اور اسم با مسمّٰے نظر آتا ہے۔ اس کے اشعار اصلیت کے حامل ہیں اور جوش و تاثیر کے بھی۔ مندرجہ ذیل قطعہ میں دنیا سے بیزاری کا اظہار کتنے موثر اور دل نشین پیرائے میں کیا گیا ہے۔ ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مگر یہ بیان کہ بلا مبالغہ ہوگا کہ غالب نے حسنِ بیان اور زورِ کلام میں کسی اور کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔ ؎

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مرزا داغ کا یہ شعر یقیناً اس شعر سے بلند تر ہے۔ ؎

جاتے تھے منہ چھپائے ہوئے میکدے کو ہم
آتے ہوئے اُدھر سے کئی پارسا ملے

داغ کا یہ شعر بھی ؎

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
اُن کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

غالب کے اس شعر سے کمتر نہیں ؎

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ داغ اپنے عہد کا بہترین غزل گو اور صاحبِ طرز شاعر تھا یہ ماننا پڑے گا کہ بحیثیتِ مجموعی اسے غالب کا ہم پلہ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

غالب کی عظمت اور اس کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کی کئی زبانوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کی زبانوں میں غالب کے ایڈیشن شائع اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں۔ اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ جتنی شرحیں دیوانِ غالب کی لکھی گئی ہیں۔ اتنی اردو کے کسی اور شاعر کے کلام کی نہیں لکھی گئیں۔

مگر یہ بڑے تعجب کی بات ہے، کہ شارحین نے کلامِ غالب کے محاسن کو اصولِ فن اور فنِ بلاغت کے نقطۂ نگاہ سے واضح کرنے پر پوری توجہ نہیں کی۔ عملی طور پر سب کی سب شرحیں درسی نوعیت کی ہیں۔ اور ادیب فاضل وغیرہ کے امیدواروں کو امتحان میں پاس ہونے کے قابل بنانے کے لئے مقصود ہیں۔ ذوقِ شعری کی تسکین اور نشو و نما ان شرحوں سے نہ ہونے کے برابر ہی ہوئی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کی توفیق صرف مولانا حالی کو ہوئی۔ جو غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی سیر حاصل تصنیف "یادگارِ غالب" میں محاسن کلام غالب پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

غالب کو عیاں کرنے میں اوّلیت کا سہرا غالباً ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کے سر ہے۔ لیکن اس ضمن میں انہوں نے سو اسو صفحوں کی جو کتاب لکھی۔ اسے شروع سے آخر تک پڑھ جانے کے بعد بھی غالب کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں ناظرین کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ البتہ وہ یہ تاثر لے سکتے ہیں۔ کہ ڈاکٹر موصوف کا مطالعۂ مغربی شاعری بہت وسیع ہے۔ اشعارِ غالب کے فنی اور دوسرے محاسن کھول کر واضح کرنا تو ایک طرف۔ اس کتاب میں بطور حوالہ بھی تین چار سے زیادہ شعر پیش نہیں کئے گئے۔ اردو کے دوسرے انگریزی دان نقادوں بھی ڈاکٹر صاحب سے آگے نہیں بڑھے۔ اور شیکسپیئر و ملٹن وغیرہ مغربی شعرا کے نظریئے اور مقولے پیش کرنے تک محدود رہے ہیں۔

آج کل بھی جب کہ ملک بھر میں اور بیرونی ممالک کے اردو نواز حلقوں میں غالب کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے۔ غالب پر جو مقالے لکھے اور پڑھے جا رہے ہیں۔ ان میں بھی غالب کی شاعرانہ عظمت اشعارِ غالب کی خوبیاں بتا کر ثابت کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر کی باتوں کو زیب داستان بنایا جا رہا ہے۔ مثلاً غالب کے عادات و خصائل کیا تھے۔ اس کے مذہبی عقائد کیا تھے۔ اس کی طرزِ ماند و بود کس قسم کی تھی وغیرہ وغیرہ۔ اکثر مقالہ نگاروں نے اپنے خیال کی تائید میں غالب کی غزلوں کے اشعار کا حوالہ دینے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ حالانکہ ہر سخن فہم اور ہر ادب دوست جانتا ہے کہ شعرا کی غزلیں ان کی زندگی اور ان کے عادات و خصائل و مذہبی عقائد کا آئینہ نہیں ہوتیں۔ امیر مینائیؔ اور ریاض خیرآبادی بدرجہ کمال پابند شریعت، متقی اور پرہیزگار تھے۔ مگر انہوں نے مے نوشی و مے پرستی کے باب میں ایسی ایسی خیال آرائیاں کی ہیں کہ بڑے سے بڑا رند بلانوش بھی کیا کرے گا۔ ایک آدھ نے یہ فتوے بھی دے ڈالا کہ وہ پرلے درجے کا بزدل۔ بے غیرت اور غدار تھا۔ ان ستم ظریفوں کو یہ کون بتائے کہ یہ سب باتیں فالتو ہیں۔ اور بعض حضرات نے تو ستم ظریفی کی انتہا کر دی ہے۔ انہوں نے اشعارِ غالب کی بنا پر غالب کے سیاسی کردار اور مجلسی اخلاق کا تجزیہ بھی کر ڈالا ہے۔ اور یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ غالب خوددار اور آزادیٔ وطن کا پرستار تھا یا مجہول ٹوڈی اور غدار۔ ان حضرات کو کون سمجھائے کہ غالب کی شاعرانہ عظمت کے موضوع سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ (میلارام وفا)

میلارام وفا

## عظمتِ غالب

ہر نکتہ شناس، ہر سخن فہم — ہے معترف کمالِ غالب
اردو کیلئے ہے مائیہ ناز — شخصیتِ بےمثالِ غالب

غالب کے دوام کی کفالت
ہے شہرتِ لازوالِ غالب

غالب کو سمجھنا ہو تو پڑھیئے — حالی کی یادگارِ غالب

غالب کا کلام بے بدل ہے — سرمایۂ افتخارِ غالب

غالب کے کمال پر ہیں شاہد — اشعارِ آبدارِ غالب

ایسے اشعار ہیں بکثرت — کہیئے جنہیں شاہکارِ غالب

خورشید و قمر بخندہ زن ہے — ہر ذرۂ رہگذارِ غالب

آرائشِ گیسوئے سخن تھا — شغلِ لیل و نہارِ غالب

تھا کہ حیات بخشِ فن تھی — طبعِ اعجاز کارِ غالب

کشافِ رموزِ معرفت تھا — کلکِ جادو نگارِ غالب

ہوتا ہے اگر کیا غلط ہے — پیغمبروں میں شمارِ غالب

ارباب ذوق کے لئے ہے
سجدے کی جگہ مزارِ غالب

*

—— جداگانہ "انداز بیان" نے غالب کو دنیائے شاعری میں ممتاز ترین مقام کما[illegible]

غالبِ نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسداللّٰہم و ہم اسداللّٰہیم

مرزا غالب کی وہ عکسی تصویر۔ جو ان کے انتقال سے چند مہینے پہلے ایک فرانسیسی فوٹو گرافر نے لی تھی

سجاد ظہیر

# غالب میری نظر میں

مجھے یاد ہے کہ آج سے تقریباً چالیس برس پہلے جب میں تعلیم کی غرض سے انگلستان جانے لگا تھا تو چند درسی کتابوں کے علاوہ میرے ساتھ دو کتابیں اور بھی تھیں ۔ ایک تو قرآن ، جو میری والدہ نے برکت کی غرض سے میرے سامان میں رکھ دی تھی اور دوسری تھی دیوانِ غالب ۔ اور اگر آج بھی مجھ سے کہا جائے کہ میں بہت دنوں کے لئے کسی دور دراز مقام پر رہنے کیلئے جاؤں ، اور صرف ایک کتاب اپنے ساتھ لے جا سکوں ، تو "الکھف" میں دیوانِ غالب کو ہی چنوں گا ۔ اچھے اور بڑے ادب کی ایک پہچان یہ ہے کہ وقت گذرنے پر وہ پرانا نہیں ہوتا ۔ اور انسان جس بھی حالت میں ہو ، جہاں بھی رہے ، جس بھی کام میں مشغول ہو اس قسم کا ادب اس کی ذہنی جمالیاتی اور روحانی تسکین کا سامان فراہم کرتا رہتا ہے ۔ اپنی جوانی کے دنوں میں میری تین اہم مشغولیتیں تھیں ۔ پہلے تو اکتسابِ علم جو یونیورسٹی کی نصابی تعلیم کے علاوہ بہت سا دوسرا لٹریچر ، کتابیں ، رسالے پڑھنے میوزیموں میں جانے اور نئی نئی جگہوں ، نئے نئے ملکوں کی سیر و سیاحت وغیرہ پر مشتمل تھا ۔ دوسرے اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد میں کسی نہ کسی طرح حصہ لینے ، اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور رفتہ رفتہ عوامی انقلابی تحریک میں شامل ہونے اور اپنے مقدور اور صلاحیت کے مطابق ، اس تحریک کو پھیلانے بڑھانے اور مضبوط کرنے میں ، اور تیسری مشغولیت تھی ، دوستی ، رفاقت ، عشق و محبت کے کوچوں میں والہانہ سرگشتگی ، صفحۂ قرطاس پر جب ان کا ذکر کرتا ہوں تب یہ الگ الگ معرفتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ لیکن فی الحقیقت یہ ایک واحد زندگی کے مختلف لیکن ایک دوسرے سے ملے جلے رُخ تھے ۔ ایسی زندگی جو اپنی تمام گوناگونی کے ساتھ اس معاشرت کی حیاتِ اجتماعی ، اس کی تند پیچ و خم ، اس کی کبھی مدھم اور آہستہ اور کبھی تیز اور پرجوش موجوں اور کبھی کبھی سطحی اور رسمی کیفیتوں سے بندھی ہوئی تھی ۔ جن کے درمیان حالات اور وقت نے مجھے پھینک دیا تھا ۔

## کلامِ غالب کی انقلابی اہمیت

آج میں خود سے سوال کرتا ہوں کہ غالب نے میری اس زندگی پر ، اور میری طرح کے دوسرے "غالب آشنا" نوجوانوں کی زندگی پر کتنا اور کیسا اثر ڈالا ۔

انسانی نفسیات کا یہ بہت پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے ۔ کہ فنونِ لطیفہ ہم پر کس طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں ۔ موسیقی ، رقص اور نغمے کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے ( اور شعر بھی انسانی تہذیب کے ارتقا میں انہیں کا ایک شاخسانہ ہے ۔ جو بعد کو ایک مستقل فن بن گیا ) کہ ان تمام فنون کا تعلق قدیم انسانی گروہوں کی اس کوشش اور کاوش سے تھا جو وہ اپنی زندگی کی پیداواری قوتوں نیز انسانی نسل کو برقرار ، محفوظ اور جاری رکھنے کے لئے کرتے تھے ۔ اور ہزاروں بلکہ لاکھوں برس گزر جانے کے بعد بھی ، اور فن کے رجعتی اور ظلمت پرست دعوے داروں کے باوجود ، اور ان لوگوں کے باوجود جو فن کا رشتہ ہماری اجتماعی اور انفرادی حیات سے توڑ کر اسے بے روح خلائے مطلق میں معلق کر دینا چاہتے ہیں ۔ اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ فن کی بہترین تخلیقات اگر ایک طرف زندگی کو زیب و زینت بخشتی ہیں ، اسے زیادہ حسین اور لطیف اور پُر نور بناتی ہیں ، تو دوسری طرف وہ رفتارِ حیات کو تیز تر کر کے ہمیں اس جانب بڑھنے میں ، ذہنی اور روحانی اور نفسیاتی طور پر مدد کرتی ہیں ، جو کسی خاص زمانے اور ماحول میں انسانوں کے تمدنی اور تہذیبی تزکیہ و ترشح کا اعلیٰ ترین نصب العین

ہوتا ہے۔ ان دو پہلوؤں کو یعنی ہندوستان کے حساس نوجوانوں کی بتیس چالیس سال پہلے کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات، نیز شعر و فن کے اعلیٰ ترین منصب) مدِ نظر رکھتے ہوئے اب ذرا غالب کے کلام پر نظر ڈالئے۔ تب آپ کو اس کی عظیم انقلابی اہمیت کا اندازہ ہوگا

# انسان کی عظمت کا اعلان

سب سے پہلے ہمیں جو چیز غالب کے کلام میں متاثر کرتی ہے وہ انسان کی اہمیت ہے۔ غالب انسان کو کائنات کی اہم ترین شے سمجھتا ہے۔ اور اس کی غالباً سب سے زیادہ قابلِ توجہ اور غیر معمولی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جبکہ ہندوستان سیاسی اور سماجی اعتبار سے، انتشار و افتراق کا شکار تھا، اور اس کے حکمران جاگیردار طبقے کی ذلالت اور پستی، آنکی بے بسی اور کمزوری کی وجہ سے تحت الثریٰ کو پہنچ گئی تھی۔ ایسے جاں گسل ماحول میں بھی غالب، انسان کی عظمت کا نعرہ بار بار بلند کرتا ہے

زبا گرم است این ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انسان شد

(انسان ایک خاک کا پردہ ہی تو ہے، لیکن جب یہ خاک انسان کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ قیامت برپا کر دیتی ہے ہستی کے شور کو تو دیکھو، ہماری ہی وجہ سے تو یہ ہنگامہ گرم ہے!)

اور اسی انسانی عظمت کا اظہار غالب نے ایک دوسرے شعر میں یوں کیا ہے:۔

ز آفرینشِ عالم غرض جز آدم نیست
بگردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است

(دُنیا کی آفرینش کا مقصد انسان کے سوا اور کچھ نہیں ہے ہمارے ہی نقطہ کے گرد ساتوں آسمان گھوم رہے ہیں)

آج مغربیت کے سامراجی اور زوال پذیر سرمایہ داری نظام کے ابتذال اور اس سے پیدا ہونے والے انسانیت دشمن نظریوں اور خود اپنی محرومیوں سے متاثر ہو کر ہمارے اپنے ملک میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ، انسان کی تذلیل و حقارت، اور انسانی زندگی کے مہمل اور بے معنی ہونے کی باتیں کرنے لگا ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ غالب کے زمانے کے ہندوستان میں زندگی آج سے کہیں زیادہ مشکل اور پُر صعوبت تھی۔ اور ہمارے سیاسی اور سماجی مسائل آج سے کم اُلجھے ہوئے نہیں تھے لیکن غالب نے اس دشوار ماحول میں زندہ رہنے کے باوجود انسان کی عظمت اور اہمیت سے نہ صرف یہ کہ انکار نہیں کیا بلکہ اپنے کلام میں اُسے کائنات کا اہم ترین نقطہ قرار دیا اور اس کی جدوجہد اور کاوشِ حیات کو اپنی فکر کا مرکزی نقطہ بنایا۔

غالب کے نزدیک انسان کی یہ اہمیت محض خیالی نہیں ہے نہ ان کی انفرادی اور اجتماعی مسائل پر بھی نظر ڈالتا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسان صرف اپنی حرکت اپنے عمل، اور اپنی جدوجہد کے ذریعہ سے انسانیت کی سطح کو اس کی موجودہ پستیوں سے نکال کر بلند تر سطح پر لے جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب کو اس کا احساس تھا کہ انسان کو تہذیبِ نفس اور مدنیت کی بہت سی دشوار گزار منزلوں سے ابھی گذرنا باقی ہے ابھی تو وہ آدمی سے انسان بھی نہیں بنا ہے۔ انسان بننے کے لئے اپنی بہیمیت، درندگی، جہالت اور وحشت، مادی کم مائیگی اور ذہنی بے بضاعتی سے نکلنے کے لئے اسے بہت سی پُر خار وادیوں سے گذرنا ہوگا اور بہتیرے جان لیوا مرحلوں کو سَر کرنا پڑے گا۔ اور انسان کی اس لافانی کوشش و کاوش، جانکاہی اور جاں سپاری کے نقوش جنون عشق و محبت کے سرشک خونیں سے رنگینی حاصل ہوتی ہے[م] اور اُسے بلند و ارفع منزلوں کی جانب لائے جانے کی سعی اور قربانی انسانی ضمیر کا درخشاں ترین جوہر نظر آنے لگی۔

# جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں

انسانی آزادی کے مجاہدین کا اس سے بہتر نعرۂ حق اور کیا ہو سکتا تھا:۔

جاں مطربِ ترانۂ "ہل من مزید" ہے
لب پردۂ سنجِ زمزمۂ "الاماں" نہیں
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

م. غالب نے اتنی حیرت انگیز سرکشش اور طرز دلآویزی کے ساتھ کھینچے۔ جس سے زندگی کا وقار پیسے دوبالا ہوگیا۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

لا محالہ آج جب ہم ان شعروں کو پڑھتے ہیں، تو ہمارا خیال فوراً کے مجاہدینِ حریت کی طرف جاتا ہے جنہوں نے اپنے آہنی عزم اور شجاعت اور بے مثال قربانیوں سے صرف اپنی قوم کو ہی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کو سربلند و سرفراز کر دیا ہے اور سامراجی زبردستی اور ظلم، وحشت اور بربریت کی کلائی مروڑ کر یہ ثابت کر دیا کہ "بزمِ عیش" میں آخری فتح "اہلِ ہوس" کی نہیں بلکہ "سختی کشانِ عشق" کی ہی ہوتی اور یہ کہ ان کا ہی جو نوکِ مژہ پر ہم "اہلِ تمنا" کیلئے "عیدِ نظارہ" ہے گا۔ یہ اور اسی قسم کا کلام خود ہمارے اپنے وطن کے جہادِ آزادی میں ہمارے دلوں کو گرماتا تھا اور ہمارے خون کی گردش تیز کرتا تھا۔

پھر جب میں ہندوستانی دانشوروں کی اس جدوجہد کا خیال کرتا ہوں، جسے ادب کی ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا، وہ تحریک انقلاب و عمل، تجدیدِ حیات، روشن خیالی، جمہوریت اور اشتراکیت کی پیام بر ہے اور جس کا مقابلہ رجعت و ظلمت کی ان طاقتوں سے تھا جو تشدد و جبر، مکر و دغا، ریا اور دروغ اور روایت پرستی کے تمام حربوں کو استعمال کر کے اس تحریک کو کچل دینا چاہتی تھیں۔ تب بھی ہمارا سب سے بڑا سہارا اور انسپریشن غالب ہی کا کلام تھا، جس نے ہم سے کہا تھا:-

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اور جب تشدد و جبر کا مقابلہ کرنا پڑا تب موجودہ عہد کے ایک ترقی پسند شاعر نے زندانِ الم سے بے دریغ یہ آواز بلند کی کہ:-

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ فیض کے اس شعر میں غالب کی سی فکر کارفرما ہے۔ حق اور انصاف، انسانی آزادی اور علوئے انسان کے عظیم کارنامے جس میں ہم مشغول تھے، غالب نے بتایا کہ یہ انسان کی شریف ترین کاوش ہے اور انسان کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرنے اور مصائب کو جھیلنے کے باوجود اس میدان سے پیٹھ نہ موڑے:-

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

## غالب کے عہد کا ہندوستانی سماج

عافیت کوشوں، مصلحت اندیشوں، قدامت پرستوں کو غالب نے حقارت کی نظر سے دیکھا اور کہا کہ یہ گروہ نہیں بلکہ وہ لوگ عزت کے قابل ہیں جو بلند انسانی نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی صعوبتیں جھیلتے ہیں، قربانیاں کرتے ہیں اور استقلال اور استقامت کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہتے ہیں:-

رشک بر تشنۂ تنہا روِ وادی دارم
نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزم شاں

(مجھے تو اس مسافر پر رشک آتا ہے جو اکیلا بھی ہے اور پیاسا بھی، لیکن اپنا سفر طے کرتا جاتا ہے) حرم کے آسودہ دلوں پر نہیں اور نہ ان کے زمزم کے چشمے پر)

اسی مضمون کو ایک دوسرے مشہور شعر میں غالب نے یوں پیش کیا:-

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

غالب آج سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے ہندوستانی سماج کا فرد تھا، اور یہ سماج اس زمانہ میں آج سے بھی زیادہ قدامت پرستی توہم، بے عقلی اور فرسودہ رسوم و رواج کی زنجیروں سے بندھا ہوا تھا۔ آج بھی نئی زندگی کی تعمیر میں ہم ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آج بھی ذات پات، مذہب دھرم، رنگ نسل، زبان اور کلچر کی دیواریں انسانوں کو برابری اور محبت کی سطح پر ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور زندگی کو وسیع تر اور بہتر بنانے سے روکتی ہیں۔ لیکن غالب ہم سے کہتا ہے:-

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

اور اس نے یہ آواز بلند کی :-

بیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم
دگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
بہ جنگ باج ستانانِ شاخسارے را
تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

(آؤ ہم تم مل کر آسمان کے طور و طریقوں اور روش کو پلٹ دیں، اور اپنے بڑے بڑے شراب کے پیالے کو گردش میں لاکر قضا اور قسمت کو بدل دیں .... اگر شحنہ (جابر حکمران) سے ہماری لڑائی ہو تو اس کی فکر نہ کریں، اور اگر خود بادشاہ ہمیں تحفہ بھیج کر رام کرنے کی کوشش کرے تب اس کے تحفہ کو لوٹا دیں، ہم جنگ کریں اور ان لوگوں (لٹیروں اور ظالموں) کو جو ہماری پھولوں سے بھری شاخوں سے (پھل توڑ کر) خراج وصول کرتے ہیں، گلستاں سے خالی جھولیاں لئے واپس جانے پر مجبور کر دیں)

## سب سے اچھا ساتھی اور رفیق

اگر ہم غالب کے کلام کے مجموعی تاثر اور اس کی فکر کے بنیادی عناصر کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو ہمیں اس میں کائنات فطرت اور حیات کا بڑا ہی متحرک، رنگین، ارضی اور مادی تصور نظر آتا ہے، جو ہر لحظہ اپنی شکست و ریخت، اور تبدیلیوں کے ذریعے ارتقاپذیر ہے۔ اور جس میں انسان کے سینے میں موجزن عشق و محبت کا جذبہ اور آرزو اور تمنا اور شوق نئی سے نئی اور کم تر سے زیادہ آسودگی حاصل کرنے کی کاوش میں زندگی کو حیرتناک حسن اور دلکشی عطا کرتے ہیں۔ غالب اگر ماتم کرتا ہے تو وہ "ماتم یک شہر آرزو" ہے۔ اور وہ فطرت کا حسن ہے جو شاعر سے رنگین نوازی کا مطالبہ کرتا ہے

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

اور غالب اپنی آنکھوں کو "ہر رنگ" میں کھلی رکھنا چاہتا ہے۔

نظارہ ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

میں غالب انسان کی تمام امکانی ترقیوں، بلند پروازیوں اور اس کے شوق و آرزو کی تمام ممکنہ آسودگیوں اور تسلیوں کو ناکافی سمجھتا ہے اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ انسان کے ذوق و کاوش کی کوئی آخری منزل نہیں دیکھتا، بلکہ وہ اس کی مسلسل اور لامتناہی انفرادی اور اجتماعی روحانی اور مادی حرکت و رفتار اور پیش روی کا پیغامبر ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں ایک آفاقی بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کرکے ہماری زندگی کو ہمیشہ اور ہر لحظہ پہلے سے زیادہ پرمعنی، زیادہ آزاد اور زیادہ پرجمال و پرتمکنت دیکھنا چاہتا ہے۔ ہم کبھی اس کا یہ لافانی شعر فراموش نہیں کر سکتے :-

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب؟
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

غالب کے فکر و فن کی یہی جولانی اور تابندگی اسے جاودانی بخشتی ہے، وہ ہماری حیات کے لطیف ترین پہلوؤں پر نور افشانی کرتا ہے، وہ اسے مزین کرتا ہے۔ رفتار و حرکت کی جانب مائل کرتا ہے۔ اور ناکامیوں، پستیوں، محرومیوں سے نبرد آزما ہو کر تازہ بتازہ اور نو بہ نو بلندیوں کی طرف اٹھانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے وہ ہر حال اور ہر رنگ میں ہمارا سب سے اچھا ساتھی اور رفیق راہ ہے۔ اسی لئے ہم اس کی عزت کرتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

پروفیسر سید احتشام حسین

# غالب کے نغموں میں وحدتِ انسانی

ہر زبان اور قوم کی شاعری میں وہ قدیم ہو یا جدید، تشبیہوں اور استعاروں علامتوں اور تمثالوں، تلمیحوں اور تمثیلوں سے کام لیا گیا ہے۔ ایک حیثیت سے یہ اظہار کے فطری سہارے اور سازِ معنی کے چھپے ہوئے پردے ہیں۔ جن سے شاعر اپنے پیرائے بیان میں معنی کی پہلیاں پیدا کرتا ہے۔ ہر شاعر اپنے شعور اور روحانی ذہن کے مطابق انہیں تاریخ، تہذیب، رسم و رواج، مذہبی عقائد، قصص و حکایات اور تخیلی مفروضات سے حاصل کرتا ہے اور اپنے تجربات کے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری شیخ و برہمن، کعبہ و کلیسا، بادہ و ساغر، قفس و آشیاں، دشنہ و خنجر، زمین و فلک، دشت و صحرا، گل و بلبل، آئینہ و رنگ، عشق و جنوں، زنجیر و مجنوں کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ اور شاعروں نے انہیں سے اپنی بزمِ فکر سجائی ہے۔ اور انہیں کو نئے نئے رنگ دیکر اپنے تجربات کی دنیا آباد کی ہے۔ مرزا غالب کی معنی آفرینی بھی بہت کچھ انہیں علامتوں اور تمثیلوں کی رہینِ منت ہے۔ ان کے افکار کی دنیا میں داخل ہونے کیلئے ان سے نہ صرف واقفیت ضروری ہے بلکہ غالب کے طرزِ فکر اور احساسِ فن سے انہیں مربوط کرنے کی بھی ضرورت ہے ورنہ ان کی انفرادیت کے خط و خال واضح نہ ہو سکیں گے۔

مرزا غالب کے خیالوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ زمین آسمان دونوں کی خبر رکھتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہتے ہیں اور دونوں کے متعلق سوچتے ہیں۔ وہ زمین سے نکلنے والے لالہ و گل کی ماہیت پر بھی غور کرتے ہیں۔ اور آسمان میں بچھے ہوئے تاروں کے جال کا راز بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان سب کے اندرونی روابط کیا ہیں۔ اس سے وہ فکری سفر پیدا ہوتا ہے جو انسان اور کائنات کی غرض و غایت کو سمجھنے پر اکساتا ہے۔ اور مذہب کی حقیقت جاننے کا شوق پیدا کرتا ہے۔ دیر و کعبہ، کلیسا اور صنم کدہ، شیخ و برہمن سے دلچسپی اسی ذوقِ جستجو کا نتیجہ ہے۔ شاعر اور فنکار کی حیثیت سے ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز فلسفیوں سے مختلف ہے۔ لیکن اس کی تہ میں یہی کرید چھپی ہوئی ہے کہ یہ دنیا کیا ہے۔ کہاں سے آئی ہے اس میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ یہ مختلف مذہبوں میں بٹا ہوا کیوں ہے۔ اگر بٹ ہی گیا ہے تو ان میں فرق کیا ہے۔ کیا یہ سب ایک ہی قسم کی روحانی آسودگی کی تلاش میں نہیں ہے۔ اگر سب ایک ہیں تو پھر آپس میں منافرت اور دوری کا سبب کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جنہوں نے وید اور اپنشد، قرآن اور انجیل، اوستا اور تالمود کے ماننے والوں کو الجھائے رکھا ہے۔ اور ان فلسفیوں کو بھی جو زندگی کے مظاہر اور راز تلاش کرنے کے درپے ہیں..... مرزا غالب نے اپنی نثر و نظم میں کبھی علامتوں اور استعاروں کے پردے میں اور کبھی صاف الفاظ میں کبھی محض ایک تشکیک آمیز سوال کی شکل میں اور کبھی پیرایۂ لب و لہجے میں ان سوالات کو چھیڑا ہے۔ کوئی مستقل بحث نہیں کی ہے۔ ان کی اردو شاعری میں دیر و حرم، کعبہ و بت خانہ، کلیسا و کفر اور دین کی علامتیں بار بار آتی ہیں۔ لیکن ان سے باقاعدہ مذاہب کے اختلافات انکی خصوصیات اور عقائد پہلو بہ پہلو رکھنا مقصود نہیں نہ کسی مذہب کو بڑا، کسی کو چھوٹا کر کے دکھانا ہے بلکہ ہر جگہ ان کی مدد سے اس انسانی حقیقت کو سمجھنا ہے کہ اگر سب انسان ہیں تو مذہب کے تفرقے انہیں کس طرح الگ کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ انہوں نے مذہب کا مطالعہ کتنی گہری نظر سے کیا تھا لیکن ان کی تحریروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ہندومت، اسلام، زرتشتی عقائد اور صوفیانہ خیالات

کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اور ان میں بعض بنیادی مشترک پہلوؤں پر غور کیا تھا۔ اور سوچ سمجھ کر اس مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر کو اپنایا تھا۔ جسے عام طور پر وحدت الوجود کہا جاتا ہے جس کی رو سے حقیقت ایک ہوتی ہے اس کے مظاہر سینکڑوں ہیں۔ ناموں کا ظاہری فرق دیر و کعبہ، کلیسا اور بت خانے کی دیواریں کھڑی کرتا ہے۔ کہیں ایک ہی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو مرزا غالب نے ایک صوفیانہ فکری مسئلہ کی شکل میں شاعرانہ انداز سے پیش کیا ہے:

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے
سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بے خودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

غالب مذہب کے معاملے میں آزاد خیال تھے اور بڑے لطیف انداز میں مذاہب کے ظاہری رسوم پر طنز کرتے تھے۔ لیکن جہاں تک منزل اور مرکز کا تعلق ہے اس سے غافل نہ تھے۔ ان کے بعض اشعار اور خیالات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کی جستجو کو انسان کے لئے فطری سمجھتے تھے۔ لیکن مذہب کو آخری منزل قرار دینے کو تھک کر بیٹھ جانا خیال کرتے تھے۔ ان کا مشہور شعر ہے

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

اس کی حسین تفسیر ہے۔ انسان مسلسل تگ و دو کرتا رہے کہ تخلیق اور منشائے تخلیق کے راز دریافت کر لے۔ یہ شوق جہاں تھک کر پناہ لیتا ہے اس کا نام مذہب رکھ دیا گیا ہے۔ اور چونکہ اب بار بار ہوتا رہا ہے اس لئے دنیا میں بہت سے مذاہب وجود میں آگئے ہیں۔ چونکہ ان سب کے پیچھے تلاش کا ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ اس لئے ان کے ماننے والوں میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہے۔ اصل قدر تو اس جذبے کی کرنی چاہیئے جو ثابت قدمی کے ساتھ اس جستجو میں سرگرداں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مومن اور کافر، مندر کے پجاری اور حرم کے پاسبان، برہمن اور شیخ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ انہیں علامتوں سے کام لیکر غالب نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو مذاہب کے درمیان رواداری جذباتی ہم آہنگی اور اتحاد باہمی کا منشور بن سکتا ہے۔ کہتے ہیں ؂

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اگر کسی شخص نے سچائی اور ایمانداری سے ایک مذہب اختیار کیا اور دوسرے نے کوئی دوسرا تو اس میں جھگڑے کی بات کہاں ہے دونوں سچے ہیں اور دونوں کو ایک ہی برتاؤ کا مستحق قرار دیا جانا چاہیئے مسجد اور مندر، قبرستان اور شمشان کے لئے لڑ کر جان دینے والے اگر مذہب کے فرق کو اس نظر سے دیکھیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ مذہبوں کے ظاہری فرق کی تہ میں جو اکیلی سچائی ہے اس کی طرف غالب نے اس طرح اشارہ کیا ہے۔ ؂

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں۔

مرزا غالب نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اصل چیز کسی مذہب میں پیدا ہونا یا اس سے بے سوچے سمجھے وابستہ ہونا نہیں ہے بلکہ اس کو سچا سمجھ کر اختیار کرنا ہے۔ اس سے وفاداری بنتا ہے۔ عزت اس کی ہوتی ہے جو مذہب کو سچ سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ اور کسی لالچ یا ڈر سے اس کے قدم ڈگمگا نہیں جاتے ایک جگہ کہتے ہیں ؂

نہیں کچھ سُبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے۔

کوئی شخص ہر وقت ہاتھ میں تسبیح لئے ہو یا ہر وقت جنیو میں لپٹا ہو تو وہ اس سے پاکباز اور ایماندار نہیں ہو جاتا۔ یہ دونوں عمل ظاہری ہیں۔ نہ تسبیح والا شیخ شیخ ہے اور نہ جنیو والا برہمن برہمن شیخ اور برہمن کی سچائی کا امتحان اس وقت ہوگا جب انہیں اپنے عمل میں یقین کی جھلک بھی نظر آئے ۔ اس ڈر سے عبادت کرنا کہ اگر اس میں کمی ہوئی تو جہنم میں پھینک دیا جائیگا اس لالچ میں نمازیں پڑھنا کہ خدا خوش ہو جائے گا اور جنت میں بخش دے گا۔ عبادت کی روح کے منافی ہے۔ یہ عبادت ڈر اور لالچ کی پیداوار ہے۔ ان سے بچ کر جو عبادت کر سکے۔ وہ قابلِ عزت ہے۔ مرزا غالب نے اپنے ایک لاجواب شعر میں اس حقیقت کو یوں پیش کیا ہے ؂

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو

جس شخص کا یہ عقیدہ ہو وہ جنت اور جہنم کو غیر اہم نہ قرار دے تو کیا کرے کیونکہ یہ سبھی عبادت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ غالب نے شاعرانہ انداز میں ان پر طنز کیا ہے جو انہیں عزوجل سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ایک جگہ کہا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

دوسری جگہ لکھتے ہیں ؎

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

بنیادی طور پر یہ ساری باتیں اس ایک خیال کا جزو ہیں کہ مذہب کی طرح جنت اور دوزخ، کعبہ اور دیر، زمزم اور جامۂ احرام کی اہمیت پر زور نہ دینے سے کم نہیں ہوتی کیونکہ یہ ساری چیزیں ظاہر پرستی سے تعلق رکھتی ہیں اور مذہب کی محض رسمی علامتیں ہیں۔ چند اشعار سے غالب کا نقطۂ نظر واضح ہو جائیگا ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

زمزم پہ ہی چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ مے جامۂ احرام بہت ہے

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

گو واں نہیں تو واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

جو لوگ غالب کے طرزِ فکر اور اندازِ بیاں سے واقف ہیں انہیں اندازہ ہوگا کہ یہ اشعار محض شگفتہ مزاجی، رند مشربی یا اظہارِ آزاد روی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے پیچھے انسانیت پرستی کا ایک عظیم الشان تصور کام کر رہا ہے۔ یہ تعصب، فرقہ پرستی، تنگ نظری، نسلی انتراق، قومی اختلافات اور انسان دشمنی کے جذبات پر کاری ضرب لگاتا ہے اور جب غالب جیسے فنکار کے نغموں میں ڈھل جاتا ہے تو زمین و آسمان کی حدیں مل جاتی ہیں اور ان سے وحدتِ انسانی اور آفاقیت کے سُر نکلتے ہیں۔
(بہ شکریہ اردو مجلس آل انڈیا ریڈیو دہلی)

# غالب اکیڈمی

"غالب اکیڈمی" — غالبیات کے سلسلہ کی ایک ایسی اڈمنسٹرڈیشن کڑی ہے جس نے غالب کی یادگار کو ایک دائمی استحکام بخش دیا ہے۔ بستی نظام الدین کے ایک گوشہ میں آرام فرما غالب جب دُنیا ئے تفرح سے اپنی ابدی آرام گاہ کے پہلو میں ایک عالیشان عمارت کی تعمیر دیکھیں گے۔ جو ان کے عہدِ بیاں کی ذات پران کے کلام پر نئے انداز سے روشنی ڈالنے کا سبب بنے گی۔ جو ان کی شان کے شایان ہوگی۔ جس میں غالبیات پر میوزیم ہوگا۔ لائبریری ہوگی اور ان کے سلسلہ میں ہونے والے پروگراموں کے لئے "آڈیٹوریم ہوگا۔ تو یقیناً زبانِ شعر میں بے اختیار پکار اٹھیں گے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غالب کے سلسلہ میں یہ تعمیری کام ایک ایسی دوراندیش شخصیت کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے جو دُنیائے طب میں عصرِ حاضر کی ایک عظیم ترین شخصیت ہے۔ اور اب اس کام کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی دنیائے ادب میں بھی اپنی پرخلوص درخشاں و تابندہ ذاتِ گرامی اور اپنے عزمِ کامل نیز جدوجہد کے سبب بالکل منفرد ہوگی۔

حکیم عبدالحمید صاحب (چیئرمین ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کا نام ذہن میں آتے ہی ایک ایسا چہرہ نگاہوں میں گھومتا ہے۔ جو آصف علی روڈ کے جدید نرسنگ ہوم اور ہمدرد دواخانہ لال کنواں کے اوقاتِ مطب میں مایوس مریضوں کو زندگی، حوصلہ اور جرأت تقسیم کرتا ہے۔ جو فرداً فرداً جدید نرسنگ ہوم کے اندر ورمریضوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا جاں نواز تبسم بیماروں کی ناامیدی کو امید میں بدل دیتا ہے۔ جو پیہم اور مسلسل تحقیق و جستجو کر کے طبِ یونانی کے مقام کو بلند سے بلند تر کر رہا ہے جو تاریخِ طب کے سلسلہ میں ایک اعظیم اسکیم (انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ) کو تکمیل کے مراحل طے کرا رہا ہے۔ جو مذہب اسلام پر ایک انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز) کا بانی ہے اور اتنے بہت سے کاموں کے بار کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ جس کا ادبی ذوق بہت بلند اور مطالعہ بہت عمیق۔

غالب اکیڈمی کا خاکہ اس شخصیت نے ۱۹۳۶ء میں مرتب کیا تھا۔ آج جب ۳۳ سال بعد اس خواب کی جیتی جاگتی تعبیر سامنے آرہی ہے تو مستقبل کا مورخ قلم سنبھالے تیار بیٹھا ہے کہ اس کارنامہ کو جلی سرخیوں سے قلمبند کرے۔ اور حکیم عبدالحمید صاحب کا یہ کارنمایاں کاروانِ ادب کیلئے ایک ایسی منزل کا پتہ دے جس پر بجا طور پر ناز کیا جائے۔

اس عظیم کام کو استحکام بخشنے کیلئے ضروری ہے کہ غالب کے عقیدت مند سامنے آکر بقدر حیثیت اس مہم میں حصہ لیں اور حکیم صاحب کے علمی ایثار کے تتبع میں ممکن مالی تعاون فراہم کریں یہ ایک عظیم سکیم ہے جسکے لئے حکیم صاحب موصوف نے ۱۹۳۶ء سے اس مقصد سے خریدی ہوئی اپنی زمین (جو لاکھوں روپے کی مالیت ہے) عطا کرنے کے علاوہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے بڑا مبلغ روپیہ دیا ہے۔ اس اسکیم پر لاکھوں روپے خرچ ہوں گے۔ اس میں تعاون کی پیشکش کرنیوالے حضرات سے اپیل غالب اکیڈمی ہمدرد بلڈنگ لال کنواں دلی نمبر۶ سے رجوع کریں۔

غالب پر کام کرنیوالے طالبِ علم، ریسرچ سکالر اور وسیع مطالعہ کا ذوق رکھنے والے اس اکیڈمی سے مستفید ہوں گے۔ اور اس طرح یہ ایک ایسا بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ ہوگا

مالک رام

# غالب ـ شخصیت اور شاعری

اسداللہ خاں غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے وہ ایک معزز ترکمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو اٹھارہویں صدی کے وسط میں وسط ایشیا سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان آیا تھا۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب ایران کے ایک قدیم پیش دادی خاندان سے ملاتے تھے لیکن ان لوگوں کی تاریخی حیثیت بھی مسلّم اور واضح ہوتی ہے۔ ان کے بیشتر اجداد نے فوج میں ملازمت کا پیشہ اختیار کیا۔

ان کے جدِ امجد قسمت آزمائی کیلئے ہندوستان آئے اور لاہور کے گورنر معین الملک عرف میر منّو کی ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد وہ دہلی چلے آئے۔ جہاں شاہ عالم ثانی کے دور میں وہ شاہی ملازمت میں لے لئے گئے۔ دہلی میں مختصر سے قیام کے بعد انہوں نے آگرہ کو اپنا مستقر بنا لیا۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے عبداللہ بیگ خاں کی شادی وہیں کے ایک سابق فوجی سردار کی لڑکی سے ہوئی۔ اسداللہ خاں غالب انکے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

دہلی سلطنت کے قیام ہی سے فارسی اعلیٰ طبقہ کی زبان رہی تھی۔ اور اسی لئے ذریعہ تعلیم بھی تھی۔ اور ادبی کاموں کی زبان بھی۔ حسبِ رواج غالب ایک مدرسہ میں بھیجے گئے جہاں انہوں نے فارسی کلاسیکی ادب پڑھا۔ حسن اتفاق سے ایران کا ایک عالم سیاح عبدالصمد سفر و سیاحت کرتا ہوا ۱۸۱۱ء میں آگرہ آیا۔ ۱۴ سال کی عمر میں غالب کو اسی سے فارسی اور تھوڑی سی عربی پڑھنے کا موقعہ ملا۔ وہ غالب کے گھر میں دو سال مقیم رہا۔ یہی وہ تعلیم تھی جو اپنی زندگی میں انہوں نے حاصل کی۔

اسی اثنا میں ان کی شادی دہلی میں ریاست لوہارو کے والی کے خاندان میں ہوئی .... دارالسلطنت کی کشش ناقابلِ مزاحمت ثابت ہوئی۔ اور ۱۸۱۲ء کے قریب انہوں نے اپنا مسکن آگرہ سے تبدیل کر کے دہلی مقرر کیا۔ اپنی بقیہ زندگی بھر وہ اس قدیم تاریخی شہر میں ہی مقیم رہے۔ جو اپنے قیام کے ہزار برسوں کے دوران بہت سے حکمرانوں کا عروج و زوال دیکھ چکا تھا۔

لوہارو کے حکمران گھرانے میں ان کی شادی ان کے لئے بڑے فائدے کا سبب ثابت ہوئی۔ ان کے خسر الٰہی بخش خاں معروف جو نواب لوہارو احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ ایک مشہور شاعر اور دہلی کے ادبی حلقوں میں معروف تھے۔ خود نواب لوہارو کا دربار دہلی میں اچھا تعارف تھا۔ ان وسیلوں سے غالب نہ صرف دہلی کے بڑے بڑے شرفاء سے متعارف ہو گئے بلکہ انہیں دربارِ شاہی کے اندرونی حلقوں میں بھی رسوخ حاصل ہو گیا۔ جو ان کی سسرال کے رشتہ داروں کے اثر و رسوخ کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس زمانے میں ان کے جو تعلقات قائم ہوئے وہ سماجی اور علمی دونوں اعتبار سے پائدار اور اہم ثابت ہوئے۔ غالب کی شناسائی شاعروں اور عالموں مدبّروں اور سادہ لوحوں۔ شہزادوں اور مفلسوں سبھی سے ہوئی جس سے انہیں زندگی کے غموں اور خوشیوں، مصیبتوں اور تکلیفوں، کامیابیوں اور ناکامیوں اور امیدوں اور مایوسیوں کا ایک بھرپور اور متنوع تجربہ ہوا۔

مغل تخت پر اکبر اعظم اور تاج کے معمار شاہ جہان کی اولاد میں سے ایک ہستی رونق افروز تھی۔ حکمران خاندان کی وہ اگلی سی شان و شوکت تو نہ رہی تھی لیکن اس کے جلو میں عظمت کا جو ہالہ تھا اس کی کشش سے مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے حوصلہ مند لوگ ایک نام کے بادشاہ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے حقیقی طاقت برطانویوں کے ہاتھوں میں جا چکی تھی۔ جنہوں نے پہلے تاجروں اور پھر جاگیرداروں کی حیثیت سے ملک میں ایک مستحکم مقام و مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے بڑی احتیاط و تدبیر سے کھیل کھیلا تھا اور ملک کے مختلف حصوں میں اقتدار کے مالک بن گئے تھے۔

بادشاہ دہلی ان کا وظیفہ خوار تھا، جس کا دائرہ حکومت شہر کی فصیل تک محدود تھا۔ ان حدود میں بھی اپنے احکام کے نفاذ کیلئے وہ برطانیہ کے ایجنٹ پر منحصر تھا۔ دربارِ شاہی نہ تو اتنا دولت مند تھا کہ کسی کو کوئی بڑا مالی فائدہ پہنچا سکے اور نہ اتنا پر شوکت تھا کہ حقیقی معنی میں کسی اہل فن کے لئے باعثِ فخر ہو۔

غالب جب دہلی آئے تو ان کی عمر صرف ۱۵ سال تھی۔ بچپن ہی میں انہوں نے اردو اور فارسی میں لکھنے کا شغل اختیار کر لیا تھا۔ دہلی سے ان کے جو ناطے تھے۔ انہوں نے علم و ادب کے شعبہ میں شہرت و عزت حاصل کرنے کے لئے ان کی امنگ کو یقیناً تیز کیا ہوگا۔ اس زمانے میں انہوں نے "اسد" تخلص اختیار کیا۔

اس زمانے میں انہیں بہت مشکل اور مغلق زبان میں شعر کہنے والے کی حیثیت سے شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ان کے ہم عصروں کو جو نامانوس زبان کے عادی نہیں تھے شکایت تھی کہ ان کی زبان فہم سے بالاتر تھی۔ انہیں مہمل گو شاعر بھی کہا گیا۔ اس دور میں ان پر بعض فارسی شعراءٔ بالخصوص بیدلؔ کا بڑا اثر تھا۔ اور یہ شاعر اپنی معنیٰ آفرینی کے لئے مشہور تھے۔ بیدلؔ اورنگ زیب کے ہم عصر تھے اور ان کا انتقال ۱۷۲۰ء میں ہوا۔ فارسی شاعری میں انہوں نے ایک نیا طرز اختیار کیا۔ روایت پسند شعراء عشق، شراب یا صوفیانہ موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہے تھے۔ اپنی ادبی زندگی کے اس ابتدائی مرحلے پر، غالبؔ، بیدلؔ کے موضوع فکر اور طرزِ بیان دونوں سے متاثر ہوتے اور انہوں نے اس کا اردو میں تتبع کرنا چاہا۔

فارسی ایک بہت ترقی یافتہ زبان تھی جس نے صدیوں کے نشو و نما کے دوران ایک ایسا ذخیرہ الفاظ و طرزِ اظہار کر لیا تھا جو نازک ترین خیالات و تصورات کے اظہار پر قادر تھا۔ اردو ابھی ایک ترقی پذیر زبان تھی اور اسے بیدلؔ کے جیسے خیالات کے اظہار کا ایک مؤثر ذریعہ بننے کے لئے ابھی مختلف ارتقائی مراحل سے گزرنا تھا۔ غالبؔ کا سامنا جب اس مشکل سے ہوا تو انہوں نے اپنے تخیل کے پیچیدہ عمل کے لئے ایک نیا طرزِ اظہار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کبھی کبھی زبان نے ان کی اس کوشش کا ساتھ دیا لیکن اس تجربے کو مکمل اور یکساں طور پر کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔ اکثر ایسا ہوا کہ دقیق و پیچیدہ اندازِ بیان کے مقابلے میں خیالات بہت غیر اہم ہو کر رہ جاتے۔

اگر اس راہ پر وہ بے روک ٹوک چلتے رہتے تو ان کی طباعی و ذہانت ضائع ہوتی۔ اور وہ بھی غیر اہم شاعروں کی لمبی صف میں شامل ہو گئے ہوتے۔ لیکن زبان و ادب کی خوش قسمتی سے انہیں اس آزادی کو برتنے کی اجازت نہ دی گئی۔

مشاعروں اور نجی صحبتوں میں ان کے دوستوں اور دشمنوں، دونوں نے یکساں طور پر ان کے کلام کے ناقابل فہم ہونے کی شکایت کی۔ اس پر ان کا پہلا ردِ عمل حقارت کا تھا لیکن جب ان کے بعض گہرے دوستوں نے بھی انہیں آسان تر انداز اختیار کرنے کا مشورہ دیا تو انہوں نے اس مشورہ کا احترام کیا۔

خطاب کی حد تک مغل بادشاہ، بہادر شاہ ثانی خود بھی اردو کے شاعر تھے۔ ہم عصر شعراء کی جو سرپرستی وہ کر سکتے تھے اس کا کوئی زیادہ فائدہ نہ تھا، تاہم اپنے زمانے کی ادبی دنیا کے وہ رہنما رکن تھے بہت نو عمری ہی میں انہوں نے محمد ابراہیم ذوق کی ادبی شاگردی اختیار کر کے ان سے مشورہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اپنی زندگی میں غالب بہادر شاہ کے وسیع ادبی حلقہ کے ایک ممتاز رکن تھے۔ ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہونے پر ان کے فرائض کا بار غالب کے کندھوں پر پڑا اور انہوں نے بادشاہ کے ادبی مشیر کا رتبہ حاصل کر لیا۔

بہادر شاہ ۴ سال قبل غالب کو شاہی گھرانے کی تاریخ فارسی میں لکھنے کا کام سونپ چکے تھے۔ اس کام کے بدلے میں انہیں ۵۰ روپیہ ماہوار کا وظیفہ ملتا تھا۔ بہادر شاہ کی اردو تصنیفات و تخلیقات کے لئے ادبی مشیر کی حیثیت سے ان کو جو مزید فرائض تفویض ہوئے ان سے غالب کی مالی حالت میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی۔ ساڑھے سات سو روپے سالانہ کی پنشن کے علاوہ جو انہیں اپنے چچا کے ترکہ میں ملتی تھی اب انہیں مزید چھ سو روپے سالانہ بادشاہ کی طرف سے ملا کرتا تھا۔ تقریباً سات سال تک ان کی کل آمدنی یہی تھی۔

۱۸۵۷ء میں ملک ایک سیاسی شورش سے گزرا جب ہندوستانی عوام اپنے برطانوی آقاؤں کے ہاتھ سے اقتدار چھیننے کی خاطر بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بہادر شاہ کو پھر شہنشاہ کی حیثیت سے تخت نشین کیا گیا۔ بہت سے ہندوستانی امیر جن کی ریاستیں چھین لی گئی تھیں، اس لڑائی میں شریک ہوتے۔ لیکن یہ لوگ ملک کے مختلف حصوں میں بہت محدود علاقوں میں ہی مزاحمت کر

پائے ۔ کچھ دیر کے لئے تو ایسا لگتا تھا کہ ہندوستانی غیر ملکی اقتدار کا جوا اتار پھینکنے میں کامیاب ہوگئے، لیکن موزوں تنظیم کی کمی کی وجہ سے لڑائی کا رخ جلد ہی ہندوستانیوں کے خلاف ہوگیا۔ اس مدت کے دوران غالبؔ نے بڑی تنگی کے دن گزارے ۔ جب باغیوں کا دہلی پر تسلط ہوگیا تو برطانیوں نے ان کی پنشن روک دی ۔ بہادر شاہ کی طرف سے انہیں جو وظیفہ ملتا تھا اس کی ادائیگی بھی رک گئی ۔ کیونکہ دہلی میں ان کے برطانوی وظیفہ دہندوں کی شکست کے بعد بادشاہ کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رہا تھا ۔ برطانیہ کی طرف سے بادشاہ کے کنبے کے گذارے کیلئے ۱۰ لاکھ روپیہ سالانہ دئے جاتے تھے ۔ اس رقم سے شاہی دربار کی ظاہری شوکت قائم رکھنے میں مدد ملتی تھی ۔

۱۸۵۷ء کے آخر تک برطانویوں نے عملاً تمام ملک میں اپنے اقتدار کو دوبارہ قائم کرلیا ۔ بہادر شاہ کو گرفتار کرکے رنگون بھیج دیا گیا ۔ جہاں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو انکا انتقال ہوگیا ۔ برطانیہ کے خلاف اس شورش میں غالب نے کوئی سرگرم حصہ نہیں لیا تھا ۔ اور انہیں امید تھی کہ امن وامان بحال ہونے پر انکی پنشن دوبارہ جاری ہوجائے گی ۔ لیکن بہادر شاہ کے دربار میں متعین برطانوی مخبروں کی بعض مخالفانہ رپورٹوں کی وجہ سے وہ بھی شکوک کا مرکز بن گئے یعنی برطانوی دشمن فوجوں کا سرگرم ہمدرد سمجھا گیا ۔ نتیجتہً برطانیوں کے ذریعے دہلی کی دوبارہ فتح اور ہندوستانی مزاحمت کے تمام اشکال کو ختم کئے جانے پر بھی غالب کی پنشن بحال نہ ہوئی ۔ مئی ۱۸۶۲ء میں پنشن بحال ہونے تک انہیں اس کے لئے بہت جدوجہد کرنی پڑی ۔ جولائی ۱۸۵۹ء میں نواب یوسف علی خاں والئ رامپور نے اردو شاعری میں ان کا شاگرد ہونے کی پیشکش کی ۔ اور اس خدمت کیلئے سو روپیہ سالانہ کا معاوضہ دینا منظور کیا ۔ فروری ۱۸۶۹ء میں ان کی وفات تک یہی دونوں رقمیں ان کی کل آمدنی تھیں ۔

غالبؔ کی عظمت اس امر میں پنہاں ہے کہ انہوں نے مسلمہ ادبی روایتوں سے اپنا دامن چھڑالیا ۔ اردو نے فارسی شاعری سے عشق وشراب اور تصوف کے موضوعات کی روایتی علامتیں مستعار لی تھیں ۔ ہماری زندگی کے حقائق سے ان کا ربط و تعلق بہت کم تھا اردو کے بیشتر شعرائے متقدمین فارسی زبان پر کافی دسترس رکھتے تھے اور فارسی کے ادبی معیارات سے بے حد متاثر تھے ۔ اس کلیہ میں میرؔ اور نظیرؔ ایسے مستثنیات بہت کم تھے ۔ غالب نے اپنی اساس سے اپنا تعلق کبھی نہیں توڑا ۔ اپنے ہندوستانی ماحول کا انہیں مکمل احساس تھا ۔ اور انہیں اپنے گرد جو جذبے اور محرومیاں نظر آتی تھیں وہ ان کو اپناتے تھے ۔ انہوں نے اپنی شاعری میں انسان اور اس کے مذہبی، سماجی اور ذہنی مسائل کو جگہ دی اور انہیں ایک پائندہ آفاقیت عطا کی ۔

وہ ان عظیم اردو شاعروں میں سے ایک تھے جنہوں نے فلک نشین رہنے کی روایت کے خلاف بغاوت کی ۔ غالب ایک ماہر صناع کی چابکدستی سے اردو شاعری کو زمین پر واپس لائے ۔ ان کے قارئین کو ان کے اشعار میں اپنے دلی احساسات اور مسائل کا عکس نظر آتا تھا ۔ ان کے الفاظ ہر ایک دل کی گہرائیوں میں گونج گئے ۔

غالبؔ نے جو اصلاحی تحریک شروع کی اسے آزادؔ اور حالیؔ نے آگے بڑھایا ۔ اور وہ اقبالؔ کی فلسفیانہ عظمت کی شکل میں رونما ہوئی ۔ آج اگر ہندوستانی ادب بالعموم اور شاعری بالخصوص دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملا سکتی ہے تو اس کا سہرا بنیادی طور پر غالبؔ کے سر ہے ۔

ڈاکٹر حکم چند نیر

# مرزا غالب اور سفر

مرزا غالب کو سیر و تماشہ کی ہوس نہ تھی۔ ان کی افتادِ طبع بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ ذرا سی تکلیف بھی ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے میں طاقت رنجِ سفر اور یارانِ وطن کی جدائی کا حوصلہ نہیں پاتے تھے لیکن کچھ توقعات کے پیش نظر انہیں چار و ناچار سفر کرنا ہی پڑتا تھا۔ ان کا پہلا سفر وہ تھا جو انہوں نے عالم ارواح سے عالم آب و گل کی طرف آتے ہوئے ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو بدھ کے دن سورج نکلنے سے چار گھڑی پہلے آگرے میں پورا کیا۔ ایک خط میں اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں :-

"ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل
کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن
یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو
دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں
رجب ۱۲۱۲ھ روبکاری کے لئے یہاں بھیجا گیا۔"

ان کا دوسرا سفر دہلی کی طرف تھا۔ اور یہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں طے ہوا تھا۔ آنے اور مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد انہیں کلکتہ اور رام پور جانا پڑا۔ کلکتے کا سفر مرزا غالب کی زندگی کا سب سے لمبا سفر تھا۔ اس سفر میں انہیں فیروزپور جھرکا۔ بھرت پور کانپور لکھنؤ۔ باندہ۔ الہ آباد۔ بنارس۔ عظیم آباد اور ہگلی وغیرہ مقامات پر رکنا پڑا۔ کلکتے کا یہ سفر پنشن وغیرہ کے جھگڑے کے سلسلے میں ہوا تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں ریل اور موٹریں نہ تھیں اس لئے انہیں یہ سفر گھوڑا گاڑی اور کشتی کے ذریعہ کرنا پڑا تھا۔ کانپور پہنچ کر مرزا غالب بیمار ہو گئے تھے اور ایسے بیمار کہ ان میں چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی۔ چونکہ کانپور میں اچھے معالج نہ تھے اس لئے بیماری کی حالت میں وہ لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں وہ پانچ مہینے زیر علاج رہے۔ جب یہاں بھی ان کی طبیعت بحال نہ ہوئی تو وہ باندہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ اور جوں توں کر کے باندہ پہنچ گئے۔ یہاں خدا کے کرم اور نواب ذوالفقار علی بہادر کی تیمارداری اور عیادت سے انہیں بیماری سے نجات مل گئی۔ مقام باندہ کی یادگار وہ اردو غزلیں ہیں جو حافظ محمود شیرانی والے نسخے پر درج ملی ہیں۔ باندہ سے روانہ ہوئے تو الہ آباد ہوتے ہوئے بنارس پہنچے۔ بنارس میں یقیناً موسم برسات کے بعد آئے تھے۔ اور آموں کا موسم گذر چکا تھا۔ ورنہ مرزا غالب جیسے آموں کے رسیا بنارس کے بانکے رسیلے لنگڑے آم کا ذکر ضرور کرتے۔ بہرحال بنارس آنے کے بعد اس جنت ارضی کی رنگین فضا حسن پرور آب و ہوا اور عشق خیز نظاروں کی سیر سے ان کی طبیعت بہت جلد بحال ہو گئی۔ اور سب سے بڑی یارانِ وطن کے سوا انہیں کوئی غم نہ تھا۔ ۱۸ دسمبر ۱۸۲۶ء کو وہ کشتی میں سوار ہوئے اور عظیم آباد ہگلی ہوتے ہوئے ۲۰ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ کلکتے میں انہیں اپنے مقدمہ کی پیروی کرنی تھی۔ لیکن مقدمہ جلدی فیصل ہوتا نظر آیا۔ تو وہ منشی نصر اللہ کو اپنا وکیل مقرر کر کے دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ اور تقریباً تین برس باہر رہ کر ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی پہنچ گئے۔ اس سفر میں الہ آباد اور کلکتے میں ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ جن کی تلخی کو وہ زندگی بھر نہیں بھلا سکے۔ مرزا غالب کے اس سفر کی یادگار ادبی تخلیقات میں متعدد اردو غزلیں فارسی قصیدے اور دو فارسی مثنویاں ہیں۔ ایک مثنوی چراغ [illegible] ہے جو بنارس کی تعریف میں ہے۔ اور بنارس میں ہی لکھی گئی تھی۔ دوسری مثنوی کلکتے کے ادبی معرکے کی یادگار ہے۔ اس کا پہلا نام آشتی نامہ تھا لیکن کلیات میں باد مخالف کے نام سے چھپی۔

مرزا غالب کا چوتھا سفر رام پور کا سفر تھا۔ محمد یوسف علی خاں

نواب رام پور سے ان کے پرانے تعلقات تھے۔ ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی بدولت ان تعلقات کی تجدید ہوئی۔ اور نواب صاحب نے کچھ اشعار مرزا غالب کے پاس برائے اصلاح بھیجے۔ نواب صاحب نے انہیں رام پور آنے کی کئی بار دعوت دی۔ لیکن وہ جنوری ۱۸۶۰ء سے پہلے رام پور نہ جا سکے۔ مرزا غالب جب رام پور پہنچے تو ان کی اچھی طرح پذیرائی ہوئی۔ خاص کوٹھی قیام کے لئے ملی۔ لیکن بچوں کی وجہ سے وہ اس کوٹھی کو چھوڑ کر محلہ راجا دروازہ کے ایک شاہی مکان میں جا رہے۔ مرزا صاحب گرمی اور برسات کا موسم یہاں گذارنا چاہتے تھے لیکن عارف مرحوم کے صاحبزادوں نے دہلی چلنے کی رٹ لگا دی۔ اس لئے نواب صاحب سے اجازت لیکر ۲۴ مارچ ۱۸۶۰ء کو دہلی آ گئے۔

رام پور کا دوسرا سفر ۱۸۶۵ء میں پیش آیا۔ اس سفر کی تقریب نواب محمد یوسف علی خاں مرحوم کی تعزیت اور نواب کلب علی خاں کے جشن مسند نشینی کی تہنیت تھی۔ مرزا غالب ۱۸۶۵ء ۱۲ اکتوبر کو رام پور پہنچے۔ نواب صاحب تعظیم و تکریم اور محبت سے پیش آئے۔ اس بار انکا قیام جرنیلی کوٹھی میں تھا۔ تقریباً ۲½ مہینے رہ کر وہ ۲۸ دسمبر کو دہلی کیلئے روانہ ہوئے۔ رام گنگا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ ان کی پالکی اس پار پہنچی کہ پانی کے ایک زوردار ریلے میں پل بہہ گیا۔ مرزا صاحب کے ملازم تمام اسباب اور زاد راہ سمیت اس پار کھڑے رہ گئے۔ بہر حال بے سروسامانی کی حالت میں گرتے پڑتے مراد آباد پہنچے۔ اور دسمبر کے جاڑوں کی یہ بدنصیبی لمبی رات سرائے میں صرف ایک کمبل پر گزارنا پڑی۔ اگلی صبح مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور مراد آباد کو خبر ملی۔ تو وہ انہیں اپنے یہاں لے گئے۔ مراد آباد میں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہوئی۔ شیفتہ نے رام پور جاکر نواب صاحب کو اس حادثہ کی اطلاع دی تو نواب صاحب نے اپنا خاص آدمی بھیج کر مرزا صاحب کو رام پور چلے آنے کے لئے لکھا۔ لیکن نواب صاحب کے آدمیوں کے مراد آباد پہنچنے کے قبل وہ دہلی کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔

مرزا صاحب کا یہ سفر کامیاب ترین سفر تھا۔ نواب صاحب نے انہیں ایک ہزار روپے بتقریب تخت نشینی اور دو سو روپے بطور زادراہ عنایت فرمائے۔ لیکن مرزا غالب اس سے زیادہ کی آس لگائے ہوئے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں وہ کافی مقروض تھے۔ اور اس سے ان کی پیاس نہ بجھ سکی۔ ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

لو صاحب کچھوے کی کھائی دن بہلائے
کپڑے جھاڑے گھر کو آئے۔
۸ جنوری ماہ و سال مذکور کے دن
غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوئے

(بشکریہ اردو پروگرام آل انڈیا ریڈیو دہلی)

خواجہ احمد عباس

# غالب ایک انسان ایک شاعر

اس سال غالب کا صد سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہو چلا ہے کہ جو شخص اپنی گمنامی اور کسمپرسی کے عالم میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ ایک سو سال بعد اس کا جشن منانے کا خیال تو لوگوں کے ذہن میں آیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ غالب ایک پیغمبر تھا اور یہ کون نہیں جانتا کہ ایسے لوگوں کی قدر ان کی اپنی زندگی میں نہیں ہوتی اور ہر شاعر اسے تو اس کی موت کے بعد ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ ایران کے کلاسیکی شاعر فردوسی کے حقے سے کون واقف نہیں جسے شاہِ وقت نے ہر شعر کے لئے سونے کی ایک مہر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور جب شاہنامہ مکمل ہو گیا تو اسے چاندی کے سکے دئے جانے لگے۔ جسے غیور فردوسی نے لینے سے انکار کر دیا۔۔ روایت ہے کہ جس وقت فردوسی کا جنازہ لیجایا جا رہا تھا اس وقت سونے کی مہروں سے بورے لدے ہوئے اس کی خدمت میں حاضر کرنے کے لئے جا رہے تھے۔

یہ ستم ظریفی ہے لیکن اس سے شاعر کی زبوں حالی سے پتہ چل جاتا ہے۔ غالب صد سالہ جشن ہند اور دوسرے ممالک میں وسیع پیمانے پر منایا جا رہا ہے۔ اور اس ضمن میں لاکھوں روپئے خرچ کئے جا رہے ہیں۔ خود دہلی میں غالب میموریل اور غالب اکیڈمی کی عمارتیں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ لیکن جس مکان میں غالب نے خستہ حالی کے دن بسر کئے اور جہاں اس نے موت کو لبیک کہا وہ مکان اب بھی خستہ حالی کی واضح ترجمانی کر رہا ہے۔ ہر سندر ناتھ چٹوپادھیائے نے اس سلسلہ میں کتنی خوب بات کہی ہے

انہوں نے شاعر کو بھوکوں مارا۔ اور مجھے اب اس بات پر حیرانی ہوتی ہے کہ وہ اس کا آٹوگراف خریدنے کیلئے دھڑا دھڑ روپیہ صرف کر رہے ہیں۔

## قلم اور تلوار

اسد اللہ خاں غالب ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا جس کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ غالب نے اپنے اجداد کی فوجی روایتوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالب نے ایک ایسے سکول سے تحصیل علم کیا جہاں ذریعہ تعلیم فارسی تھا۔ پس کلاسیکی فارسی شعرا کا سحر ان پر چلا اور انہوں نے قلم پکڑ لیا۔ انہوں نے چھوٹی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو فارسی ان کی توجہ کا مرکز رہی لیکن جوں جوں اردو کو فروغ ہونے لگا وہ اردو میں بھی شعر کہنے لگے۔ ان کے ایک بہی خواہ کو لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا جہاں انہوں نے غالب کی چند غزلیں میر کو دکھائیں۔ غالب اس وقت ۱۲ سال کے تھے۔ اور میر نے ان کے تابناک مستقبل کی پیشنگوئی کی تھی مگر افسوس کہ میر جلد ہی وفات پا گئے۔ اور وہ نوعمر غالب کی رہنمائی نہ کر سکے۔

## نئی زبان کا شاعر

دوسرے اردو شاعروں کے برعکس غالب نے کسی استاد سے اصلاح نہیں لی۔ بعد کے برسوں میں وہ شاعری کو خدائی عطیہ کہنے لگے تھے۔ اردو اور غالب کا ایک دوسرے پر گہرا اثر تھا۔ نئی زبان جو بازاروں، فوجی کیمپوں اور دوسرے مقامات پر پنپ رہی تھی اسے عام لوگوں تک اپنے دل کی بات کہنے کیلئے کوئی ذریعہ درکار تھا۔ اور غالب نے یہ کام کر دکھایا۔ وہ زبان تھی جو جاندار تھی۔ خوبصورت تھی۔ لچکدار تھی۔ اور جس کو شاعر اپنی ضرورت کے مطابق ڈھال سکتا تھا۔ غالب اردو زبان کے معمار اعلیٰ ہیں۔ اردو کے ارتقاء میں ان کے رول کو شیکسپیئر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔

## جدید فکر کی چھاپ

ایک اعتبار سے غالب اردو ادب میں جدید اسلوب کا بانی تھا۔ ان کے عہد تک شاعر اپنے تصوروں میں غرق رہتا تھا۔ اور صوفیانہ نغمے الاپتا رہتا تھا۔ چونکہ جاگیردارانہ نظام کا دور دورہ تھا اس لئے شاعر کا انسانی جذبات و تجربات کا کوئی ذریعہ نہیں تھی۔ غالب نے اس سلسلہ میں نئی راہیں ہموار کیں۔ کیونکہ وہ مغربی فکر اور انگریزی ادب سے کماحقہ روشناس تھے۔ خود لالہ مالک رام جی نے بھی بہترین الفاظ میں شاعر اعظم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

## درد و کرب

لیکن غالب کی شاعری پر مغربی فکر نے زیادہ      دیا خود ان کے اپنے تجربات ان کے اپنے درد و کرب نے ان کی اپنی غربت و افلاس نے ان کی اپنی سماجی اور سیاسی بے چینی نے انہیں ایک نئی زبان بخشی۔

ہم ہندوستانیوں کی عادت سی ہے کہ ہم بڑی بڑی ادبی ہستیوں کو دیوتا بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ یا انہیں سادھو سنت کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ ہم اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ دراصل ہماری ہی مانند انسان تھے۔ اور ان کا بھی وہ انسانی جذبہ تھا جس نے ان کی شاعرانہ حس کو تقویت دی۔

یہی شخصی درد و کرب ہی ہوتا ہے جو کندن بن کر نکلتا ہے اور سارے عالم کو منور کر دیتا ہے۔

غالب کو زندگی میں دکھ اور درد بہت زیادہ ملا۔ کتاب چھپنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اور ادب سے زندگی کی بسر اوقات ممکن نہیں تھی۔ شعراء، ادباء اور مصنفین کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل کرنا پڑتی تھی۔ تاکہ دربار شاہی کے صدقے ان کے پیٹ کا مسئلہ حل ہوتا رہے۔ اور وہ مقابلتاً بہتر زندگی بسر کر سکیں۔

غالب آگرہ میں ایک پڑھے لکھے خاندان میں پیدا ہوئے اور ان کی شادی ایک رئیس اور کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی سے ہوئی۔ جو دلی میں مقیم تھی۔ کچھ مدت تک غالب اپنے سسرال میں رہے اور ان کے طفیل سے انہیں عالموں فاضلوں، شاعروں اور ادیبوں سے روشناس ہونے اور دوستی کرنے کا موقعہ ملا۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو غالب کی بعد کی زندگی میں اہم پارٹ ادا کرنا تھا۔ لیکن غالب بڑے شائستہ اور خود دار قسم کے انسان تھے۔ لہذا وہ جلد ہی اپنے مکان میں چلے آئے۔ جہاں انہیں اپنی زبوں حالی کا کھل کر کے سامنا کرنا پڑا۔ انہیں پنشن کے ساڑھے سات سو روپے سالانہ ملتے تھے۔ اور یہی ان کی مستقل آمدنی تھی۔ اس پر یہ کہ اس رقم میں سے بعض اوقات کٹوتی ہو جایا کرتی تھی۔

## جواری اور عاشق

غالب ہمیشہ ہی قرض میں جکڑے رہتے تھے وہ شطرنج اور چوسر کے شوقین و عادی تھے۔ اور اس پر چھوٹی موٹی رقم لگا کر کھیلا کرتے تھے۔ غالباً ان کی معاشی بدحالی ہی نے انہیں جواری بننے کی تحریک دی لہذا ان کا غریب خانہ بڑے بڑے امیروں کے لئے جوئے کا اڈہ بن گیا۔ شہر کوتوال غالب کا دوست اور شفیق تھا۔ لیکن اس کے تبادلے کے بعد کسی دوسرے شخص نے چارج سنبھال لیا۔ اس نے چھاپہ مارا اور سب لوگوں کو بشمول غالب گرفتار کر لیا۔ امیر جوئے باز تو یہاں رشوت دیکر بھاگ نکلے۔ وہاں غریب غالب کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ غالب صرف تین ماہ جیل میں رہے۔ لیکن اس دوران میں انہوں نے ایک طویل نظم تیار کر ڈالی۔ جو ان کی حالت زار کی صحیح ترجمانی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زمانہ کم عمری میں غالب کو کسی سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ غالباً گانے والی کوئی لڑکی تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں کیونکہ شاعروں کے لئے ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن ان کے شعروں کی اگر چیر پھاڑ کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عشق ان کے دل و دماغ تک اثر کر چکا تھا۔ اور نو عمر لڑکی نے زمانہ نو عمری ہی میں خودکشی کر لی۔ غالب کی شاعری پر اس واقعہ کا بھی گہرا اثر پڑا۔ اور ان کی شاعری میں سوز پیدا ہو گیا۔

## تضاد

غالب کی زندگی اور ان کے کردار کے متعلق بہت بڑا تضاد ہے۔ جس سے ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی ہے۔ وہ ایک بھاگی خاوند تھے۔ لیکن عشق پر تو کسی کا زور نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی اور لڑکی کو بھی دل دے بیٹھے۔

وہ ہمیشہ مفلس مگر بے حد حساس رہے۔ لیکن ان کی خودداری پر کوئی حرف نہ آ سکا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار ایک انگریز گورنر

نے انہیں بلا بھیجا۔ تاکہ ان کی نوکری کا مسئلہ حل کیا جا سکے۔ غالب پالکی میں بیٹھ کر وہاں گئے۔ لیکن وہ پالکی سے باہر نہیں نکلے کیونکہ انگریز گورنر انہیں لینے کے لئے باہر نہیں آیا تھا۔ انہیں نوکری سے ہاتھ تو دھونا ہی پڑے لیکن وہ اس کے لئے اپنی خودداری کو ترک نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کافر تو نہیں تھے لیکن کٹر مذہبی بھی نہیں تھے۔ ان کی شاعری میں انسانیت نوازی کا عنصر ملتا ہے۔ جس کو مذہب کی تنگ حد میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

جاگیردارانہ نظام کے سبھی دوسرے شعراء کی مانند غالب بھی قصیدہ گو شاعر تھے۔ لیکن وہ اپنی خودداری کا بہت دھیان رکھتے تھے۔ اور اسے کسی قیمت پر قربان کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں کتنی ہی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ انگریز گورنر کا قصہ تو بتایا ہی جا چکا ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلابی حالات و واقعات نے ان کی زندگی میں سب سے زیادہ دباؤ اور کھچاؤ فراہم کیا۔ وہ پرلے درجے کے دیش بھگت تھے۔ اور بہادر شاہ ظفر کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں ایسے شعر دیش کی کمی نہیں جو وقت کے حالات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اور انہیں ایک محب وطن کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب بغاوت کو دبا دیا گیا وہ اپنی پنشن کی تجدید کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ جسے محض اس وجہ سے بند کر دیا گیا تھا کہ غالب کو باغیوں سے ہمدردی تھی۔

## ہمہ گیر شاعر

انہوں نے بادشاہوں اور نوابوں کے قصیدے بھی لکھے۔ لیکن ایسے درد بھرے انداز میں کہ خود ان کی اپنی زبوں حالی کی منہ بولتی تصویریں کھنچ گئیں۔ انہوں نے اندرونی جذبات، درد و کرب کا بڑے خوبصورت اور رقت انگیز پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سو سال بعد بھی انکی شاعری اسی طرح زندہ جاوید ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جس نے انکی شاعری کو جلا بخشی ہے اور ہر قسم ہر قماش ہر دور کا انسان اسے پسند کرتا ہے۔

غالب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے۔ شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

PROPOSED GHALIB MEMORIAL AT NEW DELHI

دہلی میں تعمیر کی جانے والی مجوزہ غالب میموریل بلڈنگ کا ایک خاکہ

مرزا غالب کے قدردان اور سرپرست، نواب کلب علی خاں
والیٔ رامپور جنہوں نے غالب کا تاحیات وظیفہ مقرر کیا۔

شہنشاہ بہادر شاہ ظفر
جو مرزا غالب کے سرپرست بھی تھے اور شاگرد بھی۔

## مرزا غالبؔ کی مہر

مرزا غالبؔ کے
لکھے ہوئے
ایک خط کا
عکس

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم و نیاز معروض ہے جب سے حضرت کی ناسازیِ مزاج مبارک کا حال خارج سے
مسموع ہوا ہے عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میرے بال بچوں اور میرے فرزند حسین علی خاں پر
کیا گزر رہی ہے ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی ہم سب نے فاقہ کیا بارے وہ خبر
وحشت اثر غلط نکلی ہوش اس ٹھکانے ہوئے بالکل اطمینان جب ہوگا کہ آپ کے
غسل صحت کی نوید سنونگا اور قطعہ تاریخ غسل صحت لکھ کر بھیجونگا فی الحال
اتنا چاہتا ہوں کہ اس خط کا جواب پاؤں اور حقیقت مرض سے آگہی حاصل ہو
زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

رام سرن آصل اوتار

# مرزا غالب زندگی کے نقیب

مرزا غالب کے دور کو اگر دورِ گردش کہہ لیا جائے تو بجا ہوگا۔ پریشانیوں اور ناداریوں سے گھرا ہوا دور، مایوسیوں اور نامرادیوں کا عہد ۔۔۔۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ چاروں طرف بےکسی اور بےبسی چھائی ہوئی تھی۔ دہلی انگریز کے ہاتھوں لٹ چکی تھی۔ لال قلعہ کے وسیع محل جن میں کبھی غالب کی غزلیں تاجدار مغلیہ سلطنت کیلئے سامانِ راحت پیدا کرتی تھیں اب ایک ہُو کا منظر بنے بیٹھے تھے۔ بادشاہ ظفر گرفتار ہو کر جلاوطن ہو گئے ۔۔۔ مرزا بےسہارا ہو گئے۔ بےیار و مددگار ہو گئے۔ یہ ایک ایسا المیہ تھا جو غالب صاحب کے لئے قضائے ناگہانی سے کم نہ تھا۔ دربار کی پنشن بند ہو گئی۔ جب دربار والے ہی نہ رہے تو پنشن کہاں سے ملتی۔ شب و روز جام و مینا ٹکرانے والا غالب بوند بوند کو ترس گیا۔ احباب و رفیق جو دن رات دسترخوان سے نہ اٹھتے تھے ان کی شکلیں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ اس اندوہگیں ماحول میں مرزا جیسے نازک طبع شاعر کا مسکرانا اور زمانے پر پھبتیاں کسنا ایک حیرتناک معجزہ سے کم نہیں۔

مرزا غالب کی طبیعت ہمیشہ کی طرح چہکتی رہی، اُنکی شاعری چہکتی رہی اور اردو ادب کے لئے موتی لٹاتی رہی۔ وہ زمانے کی نیرنگیوں سے گھبرائے نہیں بلکہ ایک سنجیدہ مفکر کی طرح مسکراتے ہوئے مصائب و طوفان کا مقابلہ کرتے رہے۔ انہوں نے ستم ہائے روزگار کا شکوہ تک نہیں کیا، بلکہ جو بھی آشنا ان سے گردشِ ایام کا شکوہ لیکر آتے وہ انکو سمجھاتے رہے کہ بھئی صاحب میں تو بالکل ٹھیک ہوں ۔۔۔۔ ان کی "چشمِ بینا" دنیا کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھی وہ خود کہتے ہیں ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

گویا کہ شور و غل اور ہاؤ ہُو کچھ بھی نہیں محض بچوں کا کھیل ہے مرزا حالات کی سختیوں سے قطعاً بےنیاز ہیں۔

غالب کے ہاں اگر غم ہے بھی تو ایک دم بھر سے زیادہ نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب اپنے غمکدہ کی لَو کو برقِ تپاں سے روشن کرتے ہیں۔ جیسے برق کی چمک پل بھر سے زیادہ نہیں ہوتی اسی طرح غالب کے غم کی معیاد بھی زیادہ نہیں وہ محرومیٔ مسرت کا افسوس نہیں کرتے۔ ان کی نظر میں عیش و نشاط کی کیفیت دائمی نہیں کیونکہ کبھی کبھی گردشِ ایام کا خوف خوشی کی حالت میں بھی لگا رہتا ہے۔ اور پھر یہ انسانی فطرت ہے کہ خوشی کے بعد رنج انتہائی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ غالب لکھتے ہیں ؎

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

وہ تو غمزدہ دوستوں کو سمجھاتے ہیں کہ زمانے سے شکوہ کیوں؟ بےوفا یاروں سے گلا کیوں؟ کیا ہوا اگر ماحول آج موافق نہیں کل پھر ہماری ہوگی۔ غالب جہد جہد کے قائل ہیں ان کے ہاں بڑی سے بڑی تکلیف بھی ایک تماشہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ غالب سنگدل تھے ان پر گردشِ افلاک کا اثر ہی نہیں ان سے لاپرواہی تو منسوب کی جا سکتی ہے لیکن جذبۂ احساس سے عاری نہیں کہا جا سکتا ان کا یہ شعر ان کے کیفیتِ دل کا شاہد ہے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

ان کا دل بھی زمانہ کی ستم ظریفیوں سے نالاں ہے۔ ان کی آنکھوں سے بھی پرانی محفلوں کی یادیں آنسو بنکر نکلتی ہیں۔ لیکن وہ کھل کر روتے نہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے رونے سے ایک ہیجان بپا ہو جائیگا۔ کہرام مچ جائیگا۔ جس کا اثر ان کے رفقا پر پڑے گا۔ غالب خود تو تکلیف سہہ لیں گے مگر دوستوں کا دُکھ نہ برداشت ہوگا ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

یہی شعر ان کے دل کی کیفیت کو عیاں کرتا ہے۔ غالب ساری عمر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ قرض نہیں چکا سکے۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ عارف کو گود لیا لیکن وہ بھی عین عالمِ شباب میں چل بسا۔ عارف کی موت نے غالب کی نیندیں اڑا دیں۔ دلی کے اجڑنے کا غم علیحدہ۔ ذریعہ معاش شاہ ظفر تھے وہ بھی آسرا نہ رہا۔ گویا کہ مرزا غالب کو چاروں اطراف سے غم کی آگ نے جلا رکھا ہے۔ لیکن دیکھئے مرزا ان مصائب و طوفان میں بھی مسکراتے نظر آرہے ہیں۔ اُلٹا خدا سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں ؎

زندگی اپنی جب اس شکل میں گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے ہیں۔

غالب کی شاعری محض رنگینیٔ طبع کی حاجت ہی پوری نہیں کرتی اس میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ حیاتِ نَو کا پیغام ہے۔ زندہ دلی کے آثار ہیں۔ مسکراتے ہوئے جذبات ہیں۔ اداس دلوں کے لئے پیغامِ راحت ہے۔ شعر پڑھتے جایئے اور جھومتے جایئے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ بلبلِ خوش نوا نغمہ سنج ہے۔ اور بہار کی آمد آمد ہے۔ غالب ایک عظیم فلسفی تھے۔ جنہوں نے زندگی کا حقیقی معنوں میں احساس کیا وہ زندگی سے لا انتہا پیار کرتے تھے۔ وہ اپنی موت کے جلدی آنے سے ڈرتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ کچھ روز اور یہاں رہ کر نظارہ جہاں کریں۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

وہ موت سے ملتجی ہیں کہ تو اتنی جلدی آگئی ابھی تو خونِ جگر آنکھ سے آنسو بن کر نہیں ٹپکا۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے اور اس دُنیا میں رہنے دے کیونکہ مجھے یہاں ابھی بہت کام کرنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا غالب کو اس جہان سے کتنی محبت ہے۔ ان کے پہلو میں زندگی کے لئے کتنا درد ہے۔ غالب افسردہ اور مایوس انسان کو جو زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر اداس ہو گیا ہے تلقین کرتے ہیں کہ ہمیں غم نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جب تک انسان کی زندگی ہے غم ضرور ساتھ ساتھ چلے گا۔ اس سے نجات ناممکن ہے۔ ہاں غم کا خاتمہ ہماری موت پر ہی ہو سکتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مرزا صاحب زندگی کے نقیب تھے جن کی طرح پرور شاعری نے ہماری زندگی کو پُرلطف بنا دیا ورنہ یہ حقیقت ہے کہ اس ناپائیدار دُنیا میں دل کو آرام کہاں؟ سَو سال بیت جانے پر بھی غالب کی شاعری میں وہی بانکپن ہے۔ اس سائینسی دَور میں جبکہ انسان آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہے اس کے ذہنی انتشار کو دور کرنے کیلئے غالب کی غزل روح افزا ہے اس میں شک نہیں کہ دورِ جدید کے شعرائے زندگی کی نشوونما میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ مگر جو سرور مرزا کی شاعری میں ہے وہ دوسروں میں کہاں ؎

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

حق بات کی خاطر اَڑ جانا، حق بات کی خاطر کٹ مرنا ؎
یہ کام جنوں کر سکتا ہے یہ عقل کے بس کی بات نہیں
صابر ابوہری

محمد معز الدین معظم

# مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

نام مرزا اسد اللہ خاں غالب عرفیت مرزا نوشہ تھی تخلص ابتدا میں اسد تھا۔ ۱۲۳۱ھ م ۱۸۱۶ء میں غالب تخلص اختیار کیا جن غزلوں میں اسد تخلص تھا انہیں ویسا ہی رکھ چھوڑا۔ اکثر لوگ انہیں نصیری بھی کہتے ہیں اور مرزا سن کر خوش ہوتے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں ؎

منصور فرقۂ علی اللہیان منم
آوازۂ انا اسد اللہ برافگنم

تمام اقربا اثنا عشری حقیقی دوست الجماعت تھے لیکن اہنایت میں کسی طرح کی تنگی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مولانا فخرالدین کے خاندان کے مرید تھے۔ دربار اور اہلِ دربار میں کبھی اس معاملہ کو نہیں کھولتے تھے اور یہ طریقہ دہلی کے اکثر خاندانوں کا تھا۔ آپ کے دادا اپنا وطن سمرقند چھوڑ کر ہندوستان آئے اور شاہ عالم ثانی کی ملازمت اختیار کی۔ مرزا کے والد عبد اللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا نے آگرہ کے ایک مشہور خاندان میں شادی کی۔ مرزا اسد اللہ خاں بمقام آگرہ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ عالم کے دور میں طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ مرزا کے والد عبد اللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کی ملازمت اختیار کی وہاں پر بھی کسی لڑائی میں مارے گئے۔ والد کے انتقال کے وقت مرزا کی عمر ۵ سال کی تھی۔ مرزا نصر اللہ بیگ خاں صوبیدار جو مرزا کے حقیقی چچا تھے ان کے زیرِ سایہ مرزا نے اپنے چھوٹے بھائی یوسف خاں کے ساتھ اپنی ابتدائی عمر بسر کی۔ اس زمانے میں آگرہ کے مشہور معلم جناب شیخ معظم سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک پارسی معلم عبد الصمد دو برس تک مرزا کے معلم رہے۔ مرزا نے فارسی میں کافی مہارت حاصل کر لی۔ مرزا اپنے چچا کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ وہاں پر کچھ دنوں بعد چچا کا انتقال ہوا۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے آپ کا نکاح ہوا۔ اس وقت مرزا کی عمر ۱۳ برس تھی۔ اس نسبت کی وجہ سے دلی کو آپ کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی۔ اور آخری عمر تک دلی میں مقیم رہے ۱۸۲۸ء میں آپ اپنی ذاتی پنشن کا تصفیہ کرانے کلکتہ گئے اس دوران آپ کو لکھنؤ، بنارس میں بھی قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ ان مقامات پر مرزا کی کافی شہرت ہوئی۔ نواب واجد علی شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تو نواب صاحب نے سالانہ پانچ سو روپیہ وظیفہ مقرر کیا۔ ۱۸۵۰ء میں ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ نے آپ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب بخشا۔ اور خاندان تیموری کی تاریخ نویسی کیلئے پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہوئے ۱۸۵۴ء میں استاد ذوق کا انتقال ہوا تو مرزا بادشاہ کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کے دوران مرزا گھر کے باہر نہ آئے۔ گوشۂ تنہائی میں رہ کر حالات کا جائزہ لیتے رہے چھوٹے بھائی یوسف خاں نے اس زمانہ میں ۳۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے بعد مرزا کی سرکاری پنشن بند ہو گئی قریب دو برس مرزا تنگدستی کا شکار رہے۔ جب دہلی تباہ ہو گئی تو مرزا رامپور گئے۔ نواب صاحب رامپور سے ۳۰-۱۵۰ روپیہ کا تعاون تھا۔ نواب صاحب ۱۸۵۷ء میں مرزا کے شاگرد بھی ہوئے تھے۔ اور ناظم تخلص تھا۔ ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا چند روز بھی گزری۔ مرزا کو دہلی کے بغیر چین کہاں۔ چند روز بعد واپس دہلی ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد سرکاری پنشن وغیرہ جاری ہو گئی۔ آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت ہی عاجز کر دیا تھا۔ کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا۔ نقش تصویر کی طرح بیٹھے رہتے تھے۔ کسی کو کچھ کہنا ہوتا تو لکھ کر دیتا مرزا دیکھ کر جواب دے دیتے۔ چونکہ دو تین برس پہلے یہ رہ گئی تھی صبح کو پانچ سات بادام کا شیرہ ۱۲ بجے آپ

گوشت۔ شام کو چار کباب تلے ہوئے۔ آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ چند روز پہلے یہ شعر اکثر پڑھتے ۔

دم واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اس میں شک نہیں کہ مرزا اہل ہند میں فارسی کے باکمال استاد تھے۔ مگر علوم درسی کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی۔ جو کچھ حاصل کیا اپنے طبعی اور فطری ذوق سے حاصل کیا۔ اور پھر اسے درجۂ کمال پر پہنچایا۔ مرزا نے ایک فکر میں نیا انداز لفظوں میں نئی تراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی۔ خود ان کا قول ہے کہ فارسی زبان سے مجھے مناسبت ازلی ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میری طبیعت کو اس زبان سے ایک قدرتی لگاؤ ہے۔ مفتی میر عباس صاحب کو قاطع برہان بھیجتے ہوئے جو خط لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں۔

دیباچہ اور خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں وہ سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد چاہتا ہوں۔ نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں۔ لیکن ۵۵ برس سے محو سخن گذاری ہوں مبدء فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں مطابق اہل پارس کے منطق کا مزہ ابدی لایا ہوں۔

مرزا کے کھلے ہوئے دل اور کھلے ہوئے ہاتھ نے ہمیشہ مرزا کو تنگدست رکھا مگر اس تنگدستی میں بھی امارت کے ٹھاٹھ قائم تھے۔ چنانچہ ان کے اکثر خطوط سے یہ حال آئینہ ہے۔ مرزا اپنے شاگرد کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

ایک سو روپیہ منڈی وصول کر لی۔ ۴۲ روپیہ دال منڈی کی معرفت آئے تھے۔ وہ واپس دے دیئے۔ ۵۰ روپیہ محل کو دیئے۔ ۵۰ روپیہ باقی بچے وہ بکس میں رکھ دیئے۔ کلیان سودا سلف بازار گیا ہے۔ جلد آ گیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دونگا۔ غلام کو جتیا دے گئے۔ اور آخر سے بھائی میری آپ بیتی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر تمام ہوا۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

منڈی ۲۰ دن کی میعاد تھی۔ ۲ دن گذر گئے ۱۸ دن باقی تھے کہ گھر بھر گیا۔ میں کاٹ کر روپے لے لئے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ سب سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس　　نقد بکس میں ہیں۔ اس کے علاوہ چار بوتل شراب کی اور تین شیشہ گلاس توشہ خانے میں موجود ہیں۔

غالب ایک اور جگہ اپنی بیماری کا حال لکھتے ہیں۔

محل سرا اگرچہ دیوان خانہ کے بیت
قریب ہے پر کیا امکان جو چل سکوں

صبح کو ۹ بجے کھانا یہیں آ جاتا ہے۔ پلنگ پر سے ٹہل ہوا۔ ہاتھ منہ دھو کر کھایا پھر ہاتھ دھوئے۔ کوئی پلنگ پر جا پڑا۔

ایک شاگرد سے بے تکلفی تھی۔ اس نے امراؤ سنگھ نام کے ایک اور شاگرد کی بی بی　　کا حال مرزا کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ننھے ننھے بچے ہیں اب اور شادی نہ کرے تو کیا کرے۔ پھر بچے کون پالے۔ اس شخص کی ایک پہلی بی بی مر چکی تھی۔ یہ دوسری بی بی تھی۔ اب مرزا اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔

امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہے کہ دو بار بیڑیاں کٹ چکی اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ٹوٹتا ہے نہ دم نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لونگا کیوں بلا میں پھنستا ہے۔

جب ان کی پنشن کھلی تو ایک شخص کو لکھتے ہیں تجھ کو میری جان کی قسم اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہ قلیل میں کیسا فارغ البال و خوشحال ہوتا ۔۔۔۔ مرزا نے پاک خیالات اور اعلیٰ مضامین کا گنج بائے گرانمایہ اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے۔ تاہم اولاد کے معاملے میں وہ بدنصیب ہی رہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ سات بچے ہوئے مگر پندرہ پندرہ مہینے کے سب ملک عدم کو چلے گئے۔ بیوی کے بھانجے الٰہی بخش خاں مرحوم کے نواسے زین العابدین خاں تھے۔ وہ بھی شعر کہا کرتے تھے۔ اور عارف تخلص کیا کرتے تھے۔ عارف جوان مر گئے اور دو ننھے ننھے بچے یادگار چھوڑ گئے۔ بی بی نے ان بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا۔ مرزا بڑھاپے میں انہیں اپنے گلے کا ہار کئے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے پالکی میں دونوں بچے ساتھ ہوتے۔ ان کے آرام کے لئے مرزا بے آرام ہوتے تھے۔ ان کی ہر فرمائش پوری کرتے۔ افسوس کہ مرزا کے بعد وہ دونوں جوان مر گئے۔ باوجود ان مصائب و آلام کے مرزا غالب

ہوئے۔ زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ کسی بھی خیال کو فلسفیانہ طریقہ سے ظاہر کرتے اکثر کیا کرتے تھے۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

آپ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ ظرافت اور حاضر جوابی لاجواب تھی آپ کے کئی لطیفے مشہور ہیں۔ ایک دفعہ مرزا بہت ہی مقروض ہو گئے۔ قرض داروں نے نالش کر دی۔ مفتی صاحب کی عدالت میں جوابدہی کے لئے طلب ہوئے۔ جس وقت پیشی پر گئے یہ شعر پڑھا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا کو اس طرح جیل میں رہنا پڑا کپڑے میلے ہو گئے۔ جوئیں پڑ گئیں۔ ایک دن بیٹھے ان میں جوئیں چن رہے تھے ایک رئیس عیادت کو پہنچے پوچھا کیا حال ہے۔ آپ نے کہا۔

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتہ وہیں پھاڑ پھینکا اور کہا۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

مرزا کی قاطع برہان کے بہت لوگوں نے جواب لکھے اور بہت زبان درازیاں کیں کسی نے کہا حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے فرمایا بھائی اگر گدھا تمہارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دوگے۔ ایک دن مرزا کے شاگرد نے آکر کہا حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا تھا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھئے تو میں کتنا فصیح ہو گیا ہوں۔ مرزا نے کہا ارے میاں تین کوس کیوں گئے میرے پچھواڑے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھائیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

ایک مولوی صاحب ملاقات کو آئے۔ عصر کا وقت تھا رمضان کا مہینہ تھا۔ مرزا نے ملازم سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا مرزا غضب کرتے ہو۔ رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا سُنی مسلمان ہوں چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیتا ہوں۔ بہن بیمار تھی عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے وہ بولی مرتی ہوں۔ قرض کی فکر ہے۔ کہ گردن پر لئے جاتی ہوں۔ بھلا کیا فکر ہے۔ خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا بلائیں گے۔ بھوپال سے ایک صاحب دہلی کی سیر کو آئے مرزا کے بھی مشتاق تھے۔ ایک دن ملنے گھر گئے۔ مرزا ان سب سے بہت اخلاق سے پیش آئے۔ اس وقت مرزا بیٹھے سرور کر رہے تھے گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا۔ ان بے چارہ کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ بھی شوق ہے۔ انہوں نے کسی شربت کا شیشہ خیال کر کے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ ایک صاحب پاس ہی سے بولے جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ سے شیشہ رکھ دیا اور کہا کہ میں نے شربت کے دھوکے میں اٹھایا ہے۔ مرزا نے مسکرا کر انکی طرف دیکھا اور کہا۔ زہے نصیب دھوکے میں نجات ہو گئی۔

مرزا میں دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی تھیں۔ اوّل یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دی جاتی تھی کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں۔ لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اس کا جواب نہیں رکھتے۔ اہلِ ظرافت بھی اپنی نوک جھونک سے چوکتے نہیں تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا بھی مشاعرہ میں تشریف لے گئے تھے۔ حکیم آغا خاں عیش ایک خوش طبع شگفتہ مزاج شخص تھے۔ طرح میں یہ قطعہ پڑھا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

اس کے بعد آخری عمر میں نازک خیال کے طریقہ کو بالکل ترک کر دیئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کا دیوان بہت بڑا تھا.....

مولوی فضل حق صاحب اور مرزا خان عرف مرزا فانی صاحب جو
کوتوال شہر تھے مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ یہ دونوں باکمال مرزا
کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے و شعر و سخن کے
چرچے رہتے تھے۔ انہوں نے مرزا کے دیوان کو دیکھا اور مرزا
کو سمجھایا۔ اس دیوان کی کچھ غزلیں اور اشعار عام لوگوں کی
سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ مرزا نے کہا کہ اب اتنا کچھ کر چکا ہوں۔
اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا جو ہوا سو ہوا انتخاب
کرو۔ اور مشکل کلام نکال ڈالو۔ مرزا نے دیوان حوالہ کر دیا۔
دونو صاحبین نے دیوان انتخاب کیا۔ عود ہندی کو نثر میں اور
کچھ خطوط۔ اکثر خطوط میں ان لوگوں کے جواب میں جنہوں نے
کسی مشکل شعر کے معنے پوچھے یا کوئی امر تحقیق طلب فارسی
یا اردو کا دریافت کیا ہے۔ اردوئے معلیٰ ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۹ء چند
شاگردوں اور دوستوں نے جس قدر اردو کے خطوط ملے ایک
جگہ ترتیب دئے۔ اس مجموعہ کا نام مرزا نے اردوئے معلیٰ رکھا
ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی
کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں چونکہ اصلی خطوط سے معلوم ہوتا
ہے دنیا کے رنج والم ہمیشہ ہمیں پریشان کرتے رہے۔ لطائف
غیبی اس رسالہ میں مفتی سعادت علی کی طرف سے دو سے سخن
ہے۔ اگرچہ کہ اس دیباچہ میں سیف الحق کا نام کہا ہے۔
مگر اندازِ عبارت صاف کہہ رہی ہے کہ مرزا ہیں۔ تیغ تیز
مولوی احمد علی پرنسپل نے قاطع برہان کے جواب میں مؤید
البرہان لکھی تھی۔ اس کے بعض مراتب کا جواب مرزا نے تحریر
فرما کر تیغ تیز نام رکھا۔

ساطع برہان کے آخر میں چند ورق سید عبداللہ
کے نام ہیں، وہ بھی مرزا کے ہیں۔ فارسی کی تصنیفات میں
قصائد حمد و نعت بادشاہ دہلی شاہ اودھ وغیرہ کی شان میں
لکھے ہیں۔ غزلوں کا دیوان مع دیوان قصائد ۱۲۳۵ھ میں
مرتب ہو کر لوگوں کے سینہ ذوق میں پھیلا۔ پنج آہنگ اس
میں پانچ آہنگ کے پانچ باب فارسی کے انشا پردازوں
کے لئے جو کہ ان کے نئے انداز میں رکھنا چاہیں یہ عمدہ
تصنیف ہے۔ ۱۲۸۶ھ میں قاطع برہان چھپی بعد کچھ تبدیلی

اس کو پھر چھپوایا۔ نامہ غالب قاطع برہان کے کئی شخصوں نے
جواب دئے۔ چنانچہ میرٹھ میں حافظ عبدالرحیم نابینا تھے۔
انہوں نے اس کا جواب ساطع برہان لکھا۔ مرزا کے خط کے
عنوان میں حافظ صاحب موصوف کو بطور جواب چند ورق
لکھے۔ اور اس کا نام نامہ غالب رکھا۔ مہر نیمروز حکیم احسن
اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے تھے۔ انہیں تاریخ کا شوق
تھا۔ اور اہل کمال کے ساتھ عموماً تعلق خاطر رکھتے تھے۔ مرزا
نے ان کے ایما سے اوّل کتاب مذکورہ کا ایک حصہ لکھا اور
اس کے ذریعہ سنہ ۱۸۵۰ء میں باریاب حضور ہو کر خدمت تاریخ
نویسی پر مامور ہوئے۔ اور نجم الدولہ دبیر الملک مرزا
اسداللہ خاں غالب نظام جنگ خطاب ہوا۔ چنانچہ پہلی جلد
میں امیر تیمور سے ہمایوں تک حال بیان کر کے مہر نیمروز نام رکھا
دستنبو روزنامچہ ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حال بغاوت
کا ہے۔ سبد چین دو بیتیں قصائد چند جملے چند خطوط
فارسی کے درج ہیں جو کہ دیوان درج ہو سکے تھے۔ آخر
میں اپنا کلام اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ اردو کی تصنیفات نواب
حسین مرزا صاحب کے پاس اور فارسی کی تصنیفات نواب
ضیاء الدین احمد خاں صاحب کے پاس روانہ کر دیتے تھے۔ اور
یہ لوگ ترتیب کرتے جاتے۔ مرزا کو ان سے بیس برس پہلے
اپنی تاریخ وفات کا ایک مادہ ہاتھ آیا وہ بہت بھایا اور اسے
موزوں فرمایا تھا۔

من کہ باشم کہ جاوداں باشم
چوں نظیری نماند طالب مرد
دو ہر سند کدا میں سال
مرد غالب بگو کہ غالب مرد

اس حساب سے مرزا کو ۱۲۷۷ھ میں ہی مرنا چاہیے تھا کیونکہ اسی
سال شہر میں سخت وبا آئی ہزاروں آدمی مر گئے۔ ان دنوں دلی
بربادی کا غم تازہ تھا۔ چنانچہ میر مہدی [illegible] کے جواب
میں مرزا [illegible] فرماتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۷۳ پر)

پروفیسر وائیؔ

# ایک عظیم شاعر اور انسان دوست

مرزا غالب کا سارا ادبی ورثہ تقریباً ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نسبتاً چھوٹی سی کتاب نہ صرف ہندوستان میں جہاں اس عظیم شاعر کے راست وارثین رہتے ہیں بلکہ اس ملک کی سرحدوں کے باہر بھی قدر کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ غالب کی ولولہ انگیز شاعری نے جو اعلیٰ انسان دوستی سے عبارت ہے ساری دنیا کو مسحور کردیا ہے۔

غالب کو سمجھنے کا سب سے بہترین طریقہ کیا ہے؟ ہم ان کی شاعری کی روح کا ادراک کس طرح کرتے ہیں؟ ان کے واضح شاعرانہ استعاروں کو ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟ ان کی شاعری میں جذبات کی ایسی گہرائی کس بات نے پیدا کی؟ اپنی بے پناہ تخلیقی قوت کے ذریعے غالب نے ماضی اور حال کو ہم آہنگ کردیا۔ مُردہ شاعرانہ ہیئتوں میں جان ڈال دی۔ اور ان کی نشو و نما کرکے انہیں مکمل کیا۔ غالب کی حیرت انگیز شاعرانہ صلاحیتوں کے بارے میں ادبی نقادوں نے لکھا ہے لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے اور ان گہرے فلسفیانہ خیالات کے متعلق جن سے ان کی شاعری عبارت ہے فلسفیوں نے سوچا ہے، سوچ رہے ہیں اور سوچتے رہیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ غالب اپنے عہد سے آگے نکل گئے تھے اور ان کی شاعری ہندوستانی ادب کا ایک حیرت انگیز اور انوکھا واقعہ ہے۔ غالب کس طرح وجود میں آئے؟ اس حیرت انگیز جینیس کو پھلنے پھولنے میں مدد دینے والے کون سے حالات تھے؟ کئی لوگ ان سوالات پر غور کررہے ہیں۔

کسی بھی عظیم شاعر کی طرح غالب بھی اپنے عہد، اپنے ملک اور اپنے عوام سے اٹوٹ طور پر جُڑے ہوئے تھے۔ ان کی اہمیت کو صرف اردو اور فارسی زبانوں تک، جن میں انہوں نے شاعری کی تھی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری سارے برصغیر ہندوستان کے عوام کے فنکارانہ ارتقا کی تاریخ میں ایک اہم کڑی کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے غالب کو بہتر طور پر سمجھنے اور ان کے پیچیدہ و متضاد فلسفے کا ہر طرح سے جائزہ لینے کیلئے ہم سوویت محققین اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی شاعری کا ہندوستان کے ادبی عمل کے پس منظر میں، اس کے ارتقا کے انتہائی اہم قوانین کے مطابق جائزہ لیا جائے۔

غالب نے ہندوستان کے ایک مشکل دور میں زندگی گزاری، ایک ایسا دَور جو گہرے ٹکراؤ اور نمایاں تضادات سے بھرپور تھا۔ ایک سماج کی موت اور دوسرے کی پیدائش کا دَور، پرانی تہذیب کے خاتمے اور نئی تہذیب کے وجود میں آنے کا دَور۔ ان کی شاعری تباہی کے شعلوں میں تپ کر نکھری ہے۔ ان کی شاعری میں، ہر اس چیز کی جس سے شاعر گہرے طور پر وابستہ تھا تباہی پر افسوس و مایوسی کا موضوع، ایک نئی زندگی کے پرمسرت نغموں سے ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ اور اس آواز میں انسان کی عظمت و حیات ابدی پر غیر متزلزل اعتماد کی جھلک ملتی ہے۔

پرانے اور نئے، مرتے ہوئے اور ابھرتے ہوئے کا یہ حیرت انگیز امتزاج ۱۹ ویں صدی کے پورے ہندوستانی کلچر کی خصوصیت ہے۔ اسی زمانے میں کئی نغمات سنے جا سکتے ہیں جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ ہم آہنگ نہیں ہیں۔ بلکہ کبھی کبھار ایک دوسرے سے مختلف راگ کے حامل ہیں اور کبھی کبھار ایک دوسرے کی آواز کو دبا دیتے ہیں۔ لیکن حساس سننے والے اس نغمے کی اصل روح کو آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔

۱۹ویں صدی کا ہندوستانی ادب، اپنے مختلف رجحانات کے باوجود، ارتقا کے ایک واضح اور نمایاں راستے کا حامل ہے۔ جو اس ملک کی پوری معاشی سماجی اور سیاسی زندگی کے مشترکہ رجحان کا آئینہ دار ہے۔ ہندوستانی ماہرین کی اکثریت اس نئے رجحان کو "نشاۃ ثانیہ" کا نام دیتی ہے جبکہ ہم اس کے ساتھ ساتھ اس کو "روشن خیالی" کا دور قرار دیتے ہیں۔

غالب نے ایک ایسے دور میں زندگی گذاری اور شاعری کی۔ جب اردو ادب ابھی تجدید کی منزل میں داخل نہیں ہوا تھا۔ جب روشن خیالی کی تحریک نے، جو بنگال، مہاراشٹر اور مدراس میں پھیل چکی تھی اور ہندوستان کے ان علاقوں کے ادب پر اثرانداز ہو رہی تھی، اردو ادب پر ابھی اثرانداز نہیں ہوئی تھی۔ لیکن غالب اپنے دور سے آگے تھے انہوں نے اردو شاعری کے مواد و متن کو وسعت بخشی۔ جب ہم غالب کی شاعری سے تصوف کی نقاب اٹھاتے ہیں تو ہمیں جاگیردارانہ عہد وسطی کے مصائب کے بوجھ تلے دبے ہوئے انسان کا المیہ واضح طور پر نظر آتا ہے ان کی کئی تخلیقات میں اس خیال کی توثیق کی گئی ہے کہ انسان انتہائی مکمل مخلوق ہے۔ بلکہ وہ خداؤں سے بھی برتر ہے۔ غالب کی انسان دوستی، اپنے ہم عقیدہ بھائی بندوں کے لئے ہمدردی کی حدوں سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ جو اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل کے کئی اردو شاعروں کی تخلیقات کی خصوصیت تھی۔ احتشام حسین کے مطابق " وہ محبت اور ہمدردی کو انسان کا سب سے بڑا مذہب سمجھتے تھے۔ ان کے لئے وہ تمام انسان برابر تھے، جنہیں سچائی کے راستے کی تلاش تھی۔ اور جو اپنے عقائد پر مضبوطی سے قائم تھے۔

غالب نے انسان کی داخلی دنیا کو پوری گہرائی کے ساتھ پیش کرنے میں، اس کے جذبات و احساسات کو سچائی کے ساتھ نمایاں کرنے میں اور نجات کے لئے جدوجہد کرنے والے فرد اور مذہبی کٹھ ملائیت اور وسطی دور کے تعصب پر مبنی سماج کے درمیان جدوجہد کی ڈرامائیت کو واضح کرنے والی تصویریں پیش کرنے میں مہارت و ملکہ حاصل کیا تھا۔ انسان دوستی کے اس اصول کو جو غالب کی شاعری کے لئے فطری تھا، ان کے شاگرد اور معتقد خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی شاعری میں ... مزید گہرائی و گیرائی عطا کی۔

غالب کی عظمت، اس حقیقت میں بھی مضمر ہے کہ انہوں نے دوسروں سے بہت پہلے جاگیردارانہ تہذیب کے ناگزیر زوال کو سمجھ لیا، نئے دور کو ابھرتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور نئے عہد کے حقیقی معنے و مفہوم کا اندازہ لگا لیا۔ کئی ہندوستانی ادبی نقادوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اواخر میں، کلکتہ کے قیام نے غالب پر گہرا اثر ڈالا۔ اس وقت کے کلکتہ کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے نئے رجحانات سے غالب کی واقفیت نے انہیں کئی مسائل پر سوچنے کے لئے مجبور کر دیا۔ اور ان کی شاعری میں نئی زندگی کا اضافہ کیا۔ روشن خیالی کے وہ اثرات، جو اردو ادب میں ۱۹ویں صدی کی آخری چوتھائی میں ہی محسوس ہونے لگے تھے۔ اس وقت تک غالب کی شاعری میں پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکے تھے لیکن بعض حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عظیم شاعر ہندوستان کی معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی میں تبدیلیوں سے ہمدردی رکھتا تھا۔ جن کا نتیجہ بعد میں ایک نئے ادب کی نشوونما کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس معاملے میں غالب، سید احمد خاں سے بھی آگے تھے۔ جو اردو ادب میں روشن خیالی کی تحریک کے بانی تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ۱۸۴۷ء میں سید احمد خاں نے غالب سے کہا کہ وہ ابوالفضل کی "آئین اکبری" کا پیش لفظ لکھ دیں تو غالب نے اس دستاویز پر تنقید کرتے ہوئے ایک مضمون لکھ دیا۔ انہوں نے اس وقت کے ہندوستان میں اس میں اس کو بے کار قرار دیا غالب نے لکھا " ہم اب بھی چقماق سے آگ پیدا کر رہے ہیں۔ جبکہ انگریز ماچس سے آگ حاصل کرتے ہیں۔ اور بھاپ سے چلنے والی ایک مشین کی قوت، ہماری لاتعداد بھینسوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو بحری جہازوں اور انجنوں کو حرکت دیتی ہے یہ ایسی صنعت ہے جو ہمیں سیکھنی چاہیئے ... "

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

علی جواد زیدی

# غالب کے محققین ـــــ ایک جائزہ

غالب نے کہا تھا کہ ؎

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یں گوئی میں ایک شکایت کا پہلو یہ ہے کہ ان کی
زعظمت کو ان کے مرنے کے بعد ہی تسلیم کیا جائے
ہم ہمارے عظیم شاعروں اور مصنفوں کی پوری صف
بی ایسے ملیں گے۔ جنہیں اپنی زندگی میں اس قدر
ت حاصل ہوئی ہو۔ جتنی مرزا غالب کو اپنی زندگی میں
رزا غالب کے دور کے ابتدائی تذکروں میں اُن کے
سین کے کلمات ہیں۔ ان کے شاگرد مولانا حالی نے
مکمل سوانح حیات قلم بند کی۔ ان کا کلام کئی بار زیورِ
ع آراستہ ہوا۔ ان کے خطوط، دیباچے اور دیگر
تحریریں جمع اور شائع کی گئیں۔ ان کے دوستوں نے
تصاویر محفوظ رکھیں۔ یقیناً یہ ایک نا در اعزاز تھا۔
ن کی موت کے بعد اِن کاموں کو بھرپور طرح
نجام دیا گیا۔ غالب کی زندگی سے متعلق تمام
ب مواد کا پتہ لگایا گیا۔ اس سلسلے میں اس کے
روں، ہم عصروں سے تعلقات، ملاقاتوں مرثیوں وغیرہ
ت جمع کئے گئے۔ ان کی تصانیف سے متعلق
سے تبصرے لکھے گئے۔ ان کے بارے میں بیسیوں
شائع ہوئیں۔ یہ سب کچھ قابلِ تحسین و آفرین ہے۔
ے اُردو شاعری میں رشک و حسد کا ذکر کیا اور جب
ادبی بحث چلی۔ تو اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ لیکن
ہمعاصر شاعر تھے۔ تاہم انہوں نے غالب کی شہرت
عمارت کو گرانا چاہا۔ لیکن وہ ایک تنہا شخص تھے۔
ے سکالروں نے غالب پر تحقیقی مطالعے کئے۔ اپنی

زندگیاں وقف کرلیں۔ آج بھی بہت سی نمایاں شخصیتیں ہیں، جو غالب پر ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

غالب یقیناً پوری توجہ کے مستحق تھے۔ یا البتہ ان کی جاذبیت ہے۔

سودا، امیر، نظیر اور انیس ایسے بڑے شاعروں پر پوری طرح نظر نہ پڑنے دی۔ ان کے ہم عصر مثلاً مومن اور ذوق جزوی طور پر ماند پڑ گئے۔ حالیہ برسوں میں اس صورتِ حال کا ازالہ ہوا ہے۔ اور سکالروں نے دیگر استادوں کے کلام پر بھی نظر رکھی ہے۔ پھر بھی غالب کے سلسلے میں تحقیقی کام مقابلتاً زیادہ تیزی سے ہوا ہے۔ اور جو کچھ ہوا ہے وہ معیاری ہے۔

غالب کی زندگی کے بارے میں ابتدائی حالات عیار الشعرا، عمدۂ منتخبہ، گلشن بے خار، سخن شعرا، گلشن ہمیشہ بہار، گلستان بے خزاں اور آثار الصنادید میں ملتے ہیں۔

تذکروں میں غالب کے انتخابات تحقیقی کام سے متعلق سکالروں کے لئے اہم ہیں۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں شعرا کے حالات جمع کرنے کی جو باقاعدہ کوشش کی۔ وہ سابق حوالجاتی مواد کی صورت میں دستیاب سوانحی مواد سے یقیناً بہتر ہے۔

محمد حسین آزاد نے غالب کے مختلف ہم عصروں اور ان کے رشتہ داروں سے رابطہ قائم کرکے معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے شاعر کے حالات معلوم کرکے ایک سوانح نامہ تیار کیا۔ تاہم اس طرح حاصل شدہ مواد زیادہ نہ تھا۔ بشا ئد آزاد نے اس سلسلے میں پورے ذوق و شوق سے کوشش نہ کی ہو۔

کیوں کہ اُن کے استاد ذوق تھے۔

الطاف حسین حالی نے ادب میں اپنے استاد کی مکمل سوانح حیات مرتب کی۔ اُنہوں نے تمام شائع شدہ مواد کو یکجا کیا۔ اور اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر اس میں اضافے کئے۔ وُہ پہلے شخص ہیں کہ اُنہوں نے اُن کے خطوط سے کام لیا۔ اور انہیں سوانح حیات کے لئے بنیادی مواد سمجھا۔ ان کے خطوط سے غالب کی زندگی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوئے ہیں۔ ان کے سینکڑوں خطوط اُن کے دوستوں کے پاس جمع تھے۔ خطوط کے دو مجموعے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" ان کی زندگی میں ہی طباعت کے لئے تالیف کئے گئے۔ "پنج آہنگ" ان کے فارسی خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ ان کی زندگی میں دوبار زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ دوسری بار جو ایڈیشن نکلا۔ اس میں خطوط کی تعداد ۱۰۱ تک پہنچ گئی۔ منشی نول کشور نے کلیاتِ نثر فارسی میں مزید بارہ خطوط کا اضافہ کیا۔ سید مسعود حسن رضوی نے غالب کے اُن فارسی خطوط کا مجموعہ "متفرقاتِ غالب" کے نام سے شائع کیا۔ جو کلکتہ میں اپنے دوستوں کو لکھے تھے۔ دو سال بعد ۱۹۴۹ء میں قاضی عبدالودود نے "ماثرِ غالب" شائع کی۔ اس میں وُہ خطوط ہیں۔ جو اُنہوں نے ڈھاکہ میں اور کلکتہ میں اپنے دوستوں کو لکھے۔

۱۸۴۸ء کے آس پاس غالب نے فارسی میں خط لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اور اردو میں مراسلے کو مکالمے کی صورت میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۶۸ خطوط کا پہلا مجموعہ ۱۸۶۶ء میں یکجا کیا گیا یہ کام ممتاز علی خاں میرٹھی نے انجام دیا۔ اور غالب کی وفات سے چار سال قبل شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

ریاست رام پور کے حکمرانوں سے غالب کے تعلقات قریب کے رہے ہیں۔ ریاست کے وزیر اعلیٰ کرنل بشیر حسین زیدی نے امتیاز علی عرشی کو اس بات کی طرف متوجہ کر دیا۔ کہ غالب اور رام پور کے حکمرانوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی ہے۔ اسے جمع کرلیں۔ عرشی صاحب نے مکاتیبِ غالب کے نام سے ریاست میں محفوظ ۱۳۰ خطوط کا مجموعہ شائع کیا۔ حقیر اکبر آبادی اور ان کے بیٹے کے نام غالب نے خط بھیجے۔ انہیں نادراتِ غالب میں شا[ئع] کر دیا گیا ہے۔ "غالب کی نادر تحریریں" نامی کتاب [میں] کچھ تازہ خطوط شامل ہیں۔

سابق میں شائع شدہ کچھ خطوط کی ترتیب میں مو[لانا] مہیش پرشاد نے بڑی کاوش کی ہے۔ اُنہوں [نے] پورے ولیش میں منتشر کچھ دیگر خطوط کا بھی پ[تا] چلایا۔ ان کی خواہش تھی۔ کہ اُنہیں تاریخ وا[ر] جمع کیا جائے۔ یہ کام ۱۹۴۱ء میں پورا ہوا۔ جب [کہ] خطوط غالب کا پہلا حصّہ شائع ہوا۔ دوسرے حصّے [کو] مالک رام صاحب نے دوبارہ ترتیب دیا۔ اس کی اشا[عت] ہوئی ہے۔ مالک رام صاحب نے پہلے حصّے پر بھی نظ[ر] کی ہے۔ تاکہ کچھ غلطیوں کی اصلاح ہو سکے۔ یہ غلط[یاں] تاریخوں اور خط پانے والوں کے ناموں سے متعلق ہیں۔

محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی نے نادراتِ غالب بھی [۔۔۔] اس شائع شدہ خطوط کے مختلف حصّوں کو جوڑ دیا۔ ا[۔۔۔] کہا، کہ یہ خطوط اُن کے پڑدادا کرامت ہمدانی کے نام ہیں۔ [۔۔۔]ت قاضی عبدالودود صاحب اور مالک رام صا[حب] اور مالک رام صاحب نے پکڑی اور الگ الگ مقامو[ں] [۔۔۔] ان کا ذکر ہے۔

یہ خطوط مختلف نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ ان خ[طوط] کی اشاعت کے بعد اردو نثر میں ایک نئی جان پ[ڑ] [گئی۔] فرسودہ طرز کے خطوط کے بارے میں یہ سمجھا گیا [کہ] غیر ضروری مرصع نگاری، اظہارِ قابلیت یا بے جا[ن] انداز سے خطوط میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی سا[۔۔۔] آمد کی بجائے آورد معلوم ہوتے ہیں۔ ان خطوط سے [غالب] کی ادبی حیثیت میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی [۔۔۔] سے ان کی زندگی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو[ئے۔] غالب کے تقریباً سبھی سوانح نگاروں نے ان خطو[ط] [کا] مطالعہ کیا۔ اور انہیں بنیادی مواد کے طور پر استعما[ل] [کیا۔]

حالی کی کتاب "یادگارِ غالب" کے بعد نظامی بدایونی نے نکاتِ غالب لکھی۔ اس میں سوانحی خاکہ پیش کرنے میں زیادہ تر غالب کے اردو خطوط سے کام لیا گیا۔ کستان عالم غلام رسول مہر نے "غالب" نامی کتاب لکھی۔ اس میں غالب کی تحریروں اور خطوط کو بنیادی مواد کے طور پر استعمال کیا۔ یہ غالب کے سلسلہ میں ایک نمایاں اور بیش قیمت اضافہ ہے۔

ان ابتدائی کتابوں نے آنے والے سوانح نگاروں کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔ اور تحقیقی مطالعے کے نئے مواقع فراہم کئے۔ مغربی طرز کی پہلی سوانح عمری شیخ محمد اکرام نے غالب نامے کے نام سے لکھی۔ اس کی مدد سے بعد میں "حیاتِ غالب" مکمل کی گئی۔ شیخ موصوف نے اپنی کتاب میں غالب کا بحیثیت شاعر اور نثر نگار ایک تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس طرح جو مواد اکٹھا کیا گیا۔ اس سے شیخ موصوف نے حکیم فرزانہ نامی کتاب مرتب کی۔ قریب قریب اس زمانے میں مالک رام نے سوانحی مواد اکٹھا کرنا شروع کیا۔ تاکہ غالب کی کتاب کی تمہید میں پیش کیا جا سکے۔ یہ مواد اس قدر ہو گیا۔ کہ ایک تمہید کے حجم سے بڑھ گیا۔ لہٰذا اسے ذکرِ غالب کے نام سے الگ سے شائع کیا گیا۔ یہ ایک باقاعدہ ترتیب دی ہوئی کتاب ہے۔ اور اپنے موضوع کے اعتبار سے جامع ہے۔ اس کے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ہر بار اس کی افادیت اور حجم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

امتیاز علی عرشی نے اس مواد کو یکجا کیا۔ جو غالب کے ریاست رام پور کے ساتھ تعلقات سے متعلق تھا۔ اس مواد کو مکاتیبِ غالب کی تمہید کے طور پر شائع کیا گیا۔ یہ ان کی زندگی کے حالات میں ایک اہم اضافہ ہے۔

رام بابو سکسینہ کی کتاب تاریخِ ادبِ اردو میں غالب سے متعلق ایک باب کے علاوہ انگریزی میں غالب سے متعلق مواد کم ہی تھا۔ اس کتاب کے بعد ڈاکٹر ایس عبداللطیف، شری پی ایل لکھن پال اور شری جیالال کول نے غالب کے اوپر پوری پوری کتابیں لکھیں۔ جناب مالک رام کی کتاب مرزا غالب ان میں ایک اور اضافہ ہے۔ یہ کتاب جناب مالک رام نے نیشنل بک ٹرسٹ کے لئے لکھی ہے۔ پروفیسر ایم مجیب نے ساہتیہ اکیڈمی کے لئے غالب پر ایک کتاب لکھی ہے۔ رالف رسل اور خورشید الاسلام نے مشترکہ طور پر اقوامِ متحدہ کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی ادارے کے لئے غالب کے خطوط کا ترجمہ کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر بھی ایک کتاب لکھ رہی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے غالب کے اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں محمد مجیب، پی ایل لکھن پال۔ جیالال کول۔ مالک رام۔ ایچ سی سرسوت پرییا جوہری اور قرۃ العین حیدر کے نام بیان کئے جا سکتے ہیں۔

ان تفصیلی کتب کے علاوہ مختلف رسالوں میں شائع شدہ متفرق مضامین کی تعداد بہت کافی ہے۔ چند برس قبل علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر شائع ہوا تھا جس کو بعد میں مختار الدین آرزو نے احوالِ غالب کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا۔ نگار لکھنؤ۔ اردوئے معلیٰ دہلی اور سفینہ بھوپال نے خصوصی ضمیمے نکالے ہیں۔

غالب کے مطالعے کے سلسلہ میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ فرہنگوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ عبدالقوی دسنوی اور اکبر علی خاں نے اس سلسلے میں قابلِ تعریف کام انجام دیا ہے۔ عبدالقوی دسنوی نے صد سالہ برسی کی تقریبات کے موقع پر غالب پر اپنی کتاب شائع کی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ راشد حسن خاں اور امیر حسن نورانی غالب اکیڈمی دہلی کے لئے انگلش اور اردو میں فرہنگ تیار کر رہے ہیں۔ دیوانِ غالب کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ان سے بھی بہت سی مفید معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ دیوانِ غالب میں اکثر ایسے مقامات آتے ہیں۔ جہاں اوسط درجے کے قاری کو شرح کی ضرورت پڑتی ہے۔

جب انگریزی اداروں میں غالب کی کتابوں کو اہلِ نصاب کیا گیا تو اِن تصانیف کے پڑھنے میں درپیش آنے والی مشکلات کے لئے شرحوں کی اشاعت کو ضروری سمجھا گیا۔ اب تقریباً ۳۵ شرحیں شائع ہو چکی ہیں۔ سب سے پہلے "وثوقِ صراحت"

کے نام سے شرح لکھی گئی۔ اس کے علاوہ نظم۔ حسرت موہانی اور جوشش ملسیانی کی شرحیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ایک بڑی بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ان شرحوں میں صرف غالب کی اردو شاعری پر ہی توجہ دی گئی ہے۔ اور فارسی شاعری کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف ایک مخصوص طبقہ ہی غالب کی فارسی شاعری سے واقف ہے۔ لیکن امید کی جاتی ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر غالب کے فارسی دیوان کی اشاعت لوگوں میں اُن کے فارسی کلام سے دلچسپی پیدا کرے گی۔ اور فارسی کلام کی شرحیں بھی لکھی جانے لگیں گی۔

نگارشاتِ غالب کا ادب میں مقام معین کرنے کے لئے غالب پر لکھی گئی کتابوں میں ہی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ عبدالرحمان بجنوری کی کتاب محاسنِ کلام غالب کو یہ شرف حاصل ہے۔ کہ اس میں شاعر کی شخصیت فن اور فلسفہ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ خورشید اسلام کی کتاب غالب شوکت سبزواری کی کتاب فلسفہ کلام غالب اور ظ۔ انصاری کی کتاب غالب شناسی بھی قابلِ ذکر ہیں۔ غالب کا کلام اور فن۔ مقامِ غالب۔ نقدِ غالب اور ڈاکٹر کے ابوالحکیم کی افکارِ غالب بھی قابلِ قدر کتابیں ہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی کتاب نقدِ غالب میں غالب کے مرتبے سے متعلق ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون کا عنوان ہے "غالب بحیثیت محقق" اس مضمون میں انہوں نے کہا ہے کہ یہ عظیم شاعر بھی فیصلے کی غلطیوں سے مبرا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں غالب کے تئیں غیر ناقدانہ جوش و خروش سے احتراز پر زور دیا ہے۔ قاضی عبدالودود غالب کی بہت سی کتابوں کو مرتب کر رہے ہیں۔ جہانِ غالب کے نام سے ان کی بہت سی تحریریں غالب سے متعلق ہیں۔ یہ اعلیٰ معیار کے تحقیقی

کلام کا نمونہ ہے۔

مالک رام کی کتاب تلامذۂ غالب، غالب کے اوپر لکھی گئی کتابوں کے درمیان ایک اہم رابطہ قائم کرتی ہے۔ انہوں نے غالب کے شاگردوں کے حالات سے متعلق ضروری تاریخیں اور ان کی شاعری کے نمائندہ نمونے جمع کئے ہیں۔

اس کتاب کا مزید مواد فراہم ہونے کی وجہ سے اب وہ اس کے دوسرے ایڈیشن نکالنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ موصوف غالب کے معاونین اور دوستوں سے متعلق مجوزہ کتاب کے ذریعے اس رابطے میں مزید اضافے کی سوچ رہے ہیں۔

بہت کچھ دستاویزی مواد بھی جمع کیا گیا ہے۔ مثلاً کی قلمی کتابیں و نسخے دوسری متفرق تحریریں ان کے دیوان کے چھپے ہوئے ایڈیشن اور دوسری تصانیف ان کے اور ان کے قریبی دوستوں کی تصاویر اور دوسرے مختلف ذرائع سے جمع کئے گئے ہیں۔ سب سے زیادہ جمع شدہ مواد اکبر علی خاں کے پاس ہے۔ جنہوں نے اس میں مزید مفید حاشیوں کا اضافہ کیا ہے۔ اور امید ہے جلد ہی اسے کتاب کی شکل میں شائع کر دیا جائے گا۔ اس کا کچھ حصہ پرتھوی چندر کی کتاب "مرقع غالب" میں چھپ چکا ہے۔

ریسرچ سکالروں کے لئے ضروری ہے کہ انہیں تمام قلمی نسخوں اور غالب کی تصانیف کے چھپے ہوئے تمام ایڈیشنوں کا علم ہو۔ نئے قلمی نسخوں یا کچھ کم روشناس منتخب کلام کو غالب کی تصانیف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تلاش شروع ہو گئی ہے۔ اور دور دراز جگہوں سے ہر ممکن تازہ مواد حاصل کیا جا رہا ہے۔ غالب کی اردو اور فارسی بہت سی تصانیف کی نشاندہی۔ اس کے علاوہ نادر نامہ ہے۔ یہ مختصر کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔

## ردِ عمل

مری برسی منائی جا رہی ہے
مری عظمت بڑھائی جا رہی ہے
مگر یہ کیا ستم ہے ہم نشینو!
مری بولی مٹائی جا رہی ہے

(صابر ابوہری)

برہان قاطع سے پیدا شدہ اختلاف کی وضاحت کے لئے انہوں نے نامۂ غالب اور تیغِ تیز کتابیں لکھیں۔ مالک رام نے غالب پر لطائفِ غالب نام کی ایک اور کتاب لکھی۔

اس سلسلہ میں کافی تحقیقی کام ہو جانے کے باوجود سکالروں کے لئے اب بھی تحقیق کا ایک وسیع میدان ہے۔ شاعر کی عالمگیر شہرت سے فائدہ اٹھا کر اس کے مجموعہ میں جعلی نظمیں اور بناوٹی جھوٹے خطوط بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ نارینم میناوری کی کتاب "غالب کا الحاقی کلام" میں اُن اضافوں پر اظہار رائے کیا گیا ہے۔ جو آسی نے شرح کلامِ غالب میں کئے ہیں۔

غزل کے شعروں یا قصیدوں پر نظرِ ثانی اور بعد کے ایڈیشنوں میں غالب کا اُنہیں مسترد کرنا بھی ایک مسئلہ ہے۔ یادداشت کی کمی وغیرہ کے باعث اصل مسودوں میں بھی غلطیوں کا امکان ہو سکتا ہے۔ باقاعدہ تحقیق سے اب یہ سب باتیں سامنے آ رہی ہیں۔

غالب کی تحریروں میں تاریخی اور سماجی دلچسپی کا مفید مواد موجود ہے۔ اور اس نقطۂ نظر سے ان کی تحریروں کا تجزیہ مفید ہوگا۔

* * *

---

نوبہار صابر

# رُباعیات

نوبہار صابر

ہر شاخ و شجر تیغِ رواں کی زد میں
ہر غنچہ و گل برقِ تپاں کی زد میں
غالب نے جسے خونِ جگر سے سینچا
وہ گلشنِ اُردو ہے خزاں کی زد میں

انگشت بدنداں ہیں زمانے والے
اُف کھا رہے ہیں گنگے نہ کھانے والے
کرتے ہیں مشاعرے بیادِ غالب
غالب کی زباں کو بھول جانے والے

کیوں سوختۂ دوزخِ آلاف کرو؟
جنت نہ سہی داخلِ اعراف کرو
غالب کی شتابدی منانے والو
غالب کی زباں سے بھی انصاف کرو

فکر تونسوی

# چچا غالب کے نام ایک خط

بلیماراں - دلی

پیارے چچا!

یہ خط میں بلیماراں کے ایک چائے خانے سے تحریر کر رہا ہوں۔ سوچا چچا غالب بھی بلیماراں میں بیٹھ کر احباب اور رسیلیا کے نام خطوط قلمبند کیا کرتا تھا۔ جس سے ان خطوط میں حسن کشش اور جادو پیدا ہو جاتا تھا۔ چاردانگ ہندوستان میں ان خطوط نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ لہٰذا میری ناقص سمجھ میں یہ آیا کہ میں بھی بلیماراں میں بیٹھ کر ہی خط لکھوں۔ کیونکہ خوبی نہ غالب میں تھی نہ خطوط میں بلکہ بلیماراں میں تھی۔ شاید بلیماراں میں خط لکھنے سے انسان عظیم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے میں بھی عظیم ہو جاؤں — جی انسان کو عظیم بننے کیلئے کتنے فریب کھانا پڑتے ہیں۔

جیسا کہ صد سالہ جشن غالب کمیٹی کی طرف سے تمہیں مطلع کر دیا ہوگا۔ کہ ہم ہندوستانیوں کو ایک دم تمہاری عظمت کا احساس ہو گیا ہے۔ اور ہم نے تمہاری عظمت کا سکہ بٹھانے کیلئے لاکھوں روپے خرچ کرنے کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔ تمہارے انتقال کے سو سال بعد ہم تمہاری قدر و منزلت کے قائل ہوئے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہر آدمی کی عزت اس کے مرنے کے بعد کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم زندہ انسانوں کے نہیں مردہ انسانوں کے پجاری ہیں۔ جس شخص کو ہم زندگی میں ایک پیالہ گوشت کا شوربہ اور آدھا پاؤ شراب مہیا نہ کر سکے۔ اس کے مرنے کے بعد ہم اس کی قبر کی چادر پر شراب کے گھڑے انڈیل دیتے ہیں۔ اور گوشت کی دیگیں پکا پکا کر غریبوں کو کھلاتے ہیں۔ چچا غالب! تمہیں یاد ہوگا۔ تم نے ایک بار کتنی حسرت کے ساتھ لکھا تھا کہ

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

چنانچہ تمہاری پیشگوئی صحیح نکلی۔ آخر وہ دن آ گیا ہے جب تمہاری ۱۸۶۹ء کی فاقہ مستی ۱۹۶۹ء میں رنگ لائی ہے۔ لوگ تمہارا قرض لاکھوں روپے خرچ کر کے چکا رہے ہیں۔ تمہارے نام کی ڈاک ٹکٹ جاری کر رہے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تمہارے قصے دوہرا رہے ہیں۔ تمہارے نام کی لائبریری، تھیٹر ہال، تمہارا بُت تمہاری یادگار ایک عظیم الشان بلڈنگ۔ جس کا ہزاروں روپے کا بنیادی پتھر چوری بھی ہو گیا ہے لیکن ہم اس چوری سے بھی ہرگز نہیں ڈرے۔ ایک پتھر ٹوٹ گیا تو ہزاروں روپے خرچ کر کے دوسرا پتھر لے آئیں گے۔ کیونکہ ایک سو سال پہلے تم نے ہی تو کہا تھا کہ

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

تمہاری یادگار کا بنیادی پتھر جام سفال تھا۔ جسے کوئی سفلہ صفت آدمی چرا کر لے گیا۔ کچھ عاقم لوگ جو رسوا نہیں ہونا چاہتے کہتے ہیں یہ پتھر چرایا نہیں گیا۔ ایک حادثہ میں زخمی ہو گیا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور بچے یہ ٹکڑے کھیلنے کیلئے اٹھا لے گئے۔ یہ دنیا نِج نِج بچوں کا کھیل ہے۔ تم واقعی پیغمبر تھے۔ چچا غالب جب تم نے یہ شعر کہا تھا کہ

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

بہرحال چچا! اس وقت جبکہ ہم تمہاری حسین و جمیل یاد کا جشن منا رہے ہیں۔ نجانے تمہارے دل پہ کیا گزر رہی ہو۔ شاید تمہارا بھی جی چاہتا ہوگا کہ دلی آ جاؤں۔ اور اپنا جشن اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ میں نہیں جانتا جشن غالب کمیٹی نے

نہیں دعوت نامہ بھیجا ہے یا تمہاری موجودگی کے تصور سے وہ خوف کھاتے ہیں۔ لیکن اگر تم بچ بچ آ جاؤ تو اپنی دہلی میں حیرت انگیز تبدیلیاں پاؤ گے۔ بلکہ ایک دہلی کی بجائے یہاں کئی دہلیاں پاؤ گے۔ پرانی دہلی، نئی دہلی، جنوبی دہلی، مغربی دہلی، جھگی جھونپڑیوں والی دہلی، بینکوں اور ہوٹلوں کی عظیم الشان عمارتوں والی دہلی، تمہاری دہلی جو قلعہ معلّے سے بلیماراں تک محدود تھی اب پھیل کر گریٹر اعظم بن گئی ہے۔ تم سے تو پہچانی بھی نہ جائیگی لال قلعہ اگرچہ وہیں ہے لیکن اس کی دیوار کے سایہ میں فرنگی بھی چھوکرے اور چھوکریاں بیٹھ کر چرس کے دم لگاتے ہیں۔ اور تمہارا شعر پڑھتے ہیں ؎

"دم سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیئے"

اور لال قلعہ کے اندر جہاں کبھی مینا بازار لگتا تھا اور مغل شہزادیاں اپنے حسن و جمال کی چکا چوند کے ساتھ تفریح طبع کے طور پر "سیلز گرل" بن کر بیٹھا کرتی تھیں، وہاں اب سموسے اور آلو کی ٹکیاں اور مونگ پھلیاں بکتی ہیں۔ قلعہ معلّے کے اندر جہاں کبھی بہادر شاہ ظفر کی زیر صدارت ہنگامہ خیز مشاعرے ہوا کرتے تھے آج کل وہاں تمہاری لاش کو خوبصورت فریب دینے کے لئے اردو مشاعرے ضرور منعقد ہوتے ہیں جن میں واردات و تاب و جگر کی بجائے پھپالہ بلاس کے تذکرے کئے جاتے ہیں، اردو مشاعرے کے ساتھ ساتھ ہندی مشاعرے بھی گھس بیٹھ کرتے ہیں۔ کیونکہ اردو جو کبھی قوم کی تہذیبی ستھری زبان سمجھی جاتی تھی، اب سٹینڈرڈ کا مسئلہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہندی اب قلعہ معلّے کی نیشنل بھاشن بن گئی ہے۔ اس لئے ادب و علم کا تاج اس نے اردو کے سر سے چھین کر اپنے سر پر پہن لیا ہے۔ اور اب تو سنا ہے چچا پنجابی زبان کا ایک مشاعرہ بھی ہونے والا ہے۔ مغل سلطنت کا زوال تو سنا تھا، لیکن اردو مشاعروں کا زوال اس سے بھی زیادہ عبرتناک ہے۔

مگر اس زوال کے باوجود چچا ہم تمہارا صد سالہ جشن منا رہے ہیں۔ اور غضب خدا کا کہ جن لوگوں نے اردو کو دیس نکالا دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہی بڑھ چڑھ کر تمہارا جشن منانے میں۔ میں نہیں سمجھ پاتا کہ یہ جشن ہے یا ماتم اور یہ ماتم غالب کا ہے یا اردو کا؟ حیرت ہے کہ اس ماتمی جشن میں دہلی کے جن سنگھی حکمران بھی شرکت فرما رہے ہیں۔ تم نے ایک بار رقیب کے متعلق تحریر کیا تھا۔ وہ محبوبہ کے ساتھ تمہارے گھر کی طرف آیا تھا تو تم جل بھن کر کباب ہو گئے تھے۔ لیکن اب پھر وہی تمہاری محبوبہ اردو کا رقیب تمہارا جشن منانے کے لئے لال قلعہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور تم ؎

مجھ کو حیرت ہو کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

چچا جان! یہ خط میں بلیماراں کے چائے خانے کی چوبی بنچ پر بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ تمہارا گھر میرے سامنے ہے۔ جو اب تمہارا گھر نہیں لگتا بلکہ ماتم کدہ لگتا ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں آخر اس ماتم کدے میں غالب کا جشن منانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ کوئی نہ کوئی ڈپلومیٹک ضرورت ہوگی۔ ورنہ بقول تمہارے ؎

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

## ایک عظیم شاعر

صفحہ ۴۳ سے آگے ........

غالب کی شاعری اور فلسفہ، اردو ادب کے ارتقاء کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس نے اس ادب کے افق کو وسعت عطا کی، اس کو جاگیردارانہ اور دور وسطیٰ کے کلچر سے ناطہ توڑنے میں مدد دی، تنگ قسم کے مذہبی اور فلسفیانہ نظریات سے الگ کیا۔ اس کو نیا انسان دوست متن و مواد عطا کیا، اس ادب کو کل ہند ادبی عمل کے مشترکہ دھارے میں شامل کرنے کی زمین ہموار کی اور اردو ادب میں ترقی پسند جمہوری رجحانات کے فروغ و ارتقاء کے لئے سازگار حالات پیدا کئے۔

ہماری رائے میں خاص طور پر اسی میں اسی حیرت انگیز شاعر اور انسان دوست غالب کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ اسی لئے آج ان کی موت کے ایک سو سال بعد بھی ان کی شاعری اتنی گرمجوش اور ولولہ انگیز معلوم ہوتی ہے۔

عبدالحمید عدم

# غزل

باتوں پر بھی قرباں ہیں، گھاتوں پہ بھی واری ہیں
ہم تیری محبت کے، مجذوب پجاری ہیں

شاہوں کے دواروں میں، کیا ڈھونڈتا پھرتا ہے؟
یہ لوگ تو اے پاگل، خود آپ بھکاری ہیں!

انجام یہی اکثر، ہر کھیل کا دیکھا ہے
نادانیاں جیتی ہیں، دانائیاں ہاری ہیں

یُونہی تو نہیں بیٹھے، بُت خانہ و کعبہ میں
ان دونوں مکانوں میں، باتیں تیری جاری ہیں

میں نے تو نہیں دل میں، آباد کیے مندر
اصنام کی تصویریں، یزداں نے اتاری ہیں

منزل پہ پہنچنے کا، کھٹکا ہی نہیں کوئی
رہبر بھی لٹیرے ہیں، رہزن بھی شکاری ہیں

ہر چند مہینوں تک، تڑپیں گے تماشائی
صد شکر! حسینوں نے، زلفیں تو سنواری ہیں

چُپکے سے کبھی دو پل، ہنگامِ سحر آ جا
فرقت کی کٹھن راتیں، مر مر کے گزاری ہیں

ہونٹوں میں عدم اُن کے، بوندیں ہیں جو امرت کی
محسوس یہ ہوتا ہے کچھ اُن میں ہماری ہیں



## گوشوارہ

بابت ملکیت و دیگر تفاصیل متعلقہ ماہنامہ "جان نثار" امرتسر
فارم نمبر ۴

۱۔ مقام اشاعت — امرتسر
۲۔ وقفہ اشاعت — ماہنامہ
۳۔ پرنٹر کا نام — رام لال بھنڈاری
قومیت:۔ بھارتیہ
پتہ:۔ ۹۸ سبھاش نگر۔ کٹڑہ شیر سنگھ۔ امرتسر
۴۔ پبلشر کا نام — رام لال بھنڈاری
قومیت:۔ بھارتیہ
پتہ:۔ ۹۸ سبھاش نگر کٹڑہ شیر سنگھ۔ امرتسر
۵۔ ایڈیٹر کا نام — رام لال بھنڈاری
قومیت:۔ بھارتیہ
پتہ:۔ ۹۸ سبھاش نگر کٹڑہ شیر سنگھ امرتسر
۶۔ واحد مالک:۔ رام لال بھنڈاری

میں رام لال بھنڈاری اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفاصیل میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط:۔
رام لال بھنڈاری
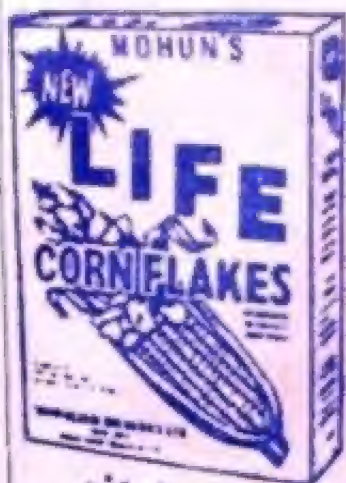
لسان الاعجاز میلا رام وفا

ماہر القادری

رتن پنڈوری

گوپال متل ایڈیٹر "تحریک"

صابر ابوہری

نوبہار صابر

رام رتن مضطر

پورن سنگھ ہنر

رام کشن مضطر

لال چند فلک

حکیم علی احمد [illegible]

# مرثیۂ غالب

الطاف حسین حالی۔

دِل کو باتیں جب اُس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دِل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعرِ غزل
کس سے دادِ سخن وری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں، کدھر جائیں

پستِ مضموں ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہلِ میت جنازہ ٹھیرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہلِ انصاف غور فرمائیں

قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھیرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

علامہ اقبال

# خراجِ عقیدت

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا / ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا / زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر / محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر / خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
آہ! تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں / ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں / آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں!
گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر / ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر / یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتیِ آبدار ایسا بھی ہے

# نذرِ غالب

میلا رام وفاؔ

صبر مشکل تھا محبت کا اثر ہونے تک
جان ٹھہری نہ دلِ دوست میں گھر ہونے تک

شبِ فرقت کی بھی ہونے کو سحر تو ہوگی
ہاں مگر ہم نہیں ہونے کے سحر ہونے تک

فرصتِ ماتمِ پروانہ کہاں سے آئے
شمع کو موت سے لڑنا ہے سحر ہونے تک

سہنے ہیں جور و ستم۔ جھیلنے ہیں رنج و الم
یعنی کرنی ہے بسر عمر بسر ہونے تک

تیرا پردہ بھی اٹھائے گی مری رسوائی
تیرا پردہ ہے مرے خاک بسر ہونے تک

اے وفاؔ معرکۂ عشق تو سر کیا ہوگا
ہو چکیں گے نہیں یہ معرکہ سر ہونے تک

التفاتِ عام ہے وجہِ پریشانی مجھے
کس قدر مہنگی پڑی ہے اپنی ارزانی مجھے

بحرِ ہستی ہے مری نظروں میں اک دشتِ سراب
ریت کا ہوتا ہے دھوکہ دیکھ کر پانی مجھے

تیرے جلووں کا تو ہر اک ذرہ ہے آئینہ دار
مانعِ نظارہ ہے خود میری حیرانی مجھے

سعیٔ بے حاصل تھی دل کی کوششِ اخفائے راز
کر گئی رسوا نگاہوں کی پریشانی مجھے

یا عدوئے بوالہوس کی ناز برداری کرو
یا بنا لو تختۂ مشقِ ستم رانی مجھے

کھل نہیں سکتی فقط اک آپ کے دل کی گرہ
ورنہ کیا کیا گتھیاں آتی ہیں سلجھانی مجھے

کس قدر ناپید ہیں اہلِ کمال اب اے وفاؔ
کوئی اپنا بھی نظر آتا نہیں ثانی مجھے

دل کی تسکیں کا آسرا نہ ہوا
ستم ان کا کرم نما نہ ہوا

زخم وہ کیا جو بھر گیا آخر
درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا

میرے نالوں سے ہل گئے افلاک
تیرے دل پر اثر ذرا نہ ہوا

کیا بلا ہے تری نگاہ کا تیر
جو خطا ہو کے بھی خطا نہ ہوا

تو نہ چاہے تو اور بات ہے یہ
تو نے چاہا اگر تو کیا نہ ہوا

تیغ جب امتحاں کی اٹھی
کوئی آگے مرے سوا نہ ہوا

تیرے دل کی گرہ ہے وہ عقدہ
آج تک جو کسی سے وا نہ ہوا

تار ٹوٹا ترے تغافل کا
مر گیا میں تو کچھ برا نہ ہوا

ٹیس دل کی کبھی فرو نہ ہوئی
ہاتھ دل سے کبھی جدا نہ ہوا

دیر اس نے بھی کی تو آنے میں
صبر تجھ سے بھی اے وفا نہ ہوا

سردار جعفری

# غ ا ل ب

آسمانوں کی بلندی کو بلا کا ناز تھا
پست ہمت جس سے ذوقِ رفعتِ پرواز تھا

رہگزارِ ماہ و انجم تک کوئی جاتا نہ تھا
کوئی شاخِ کہکشاں پر زمزمہ گاتا نہ تھا

عرش پر جبریل کا دمساز ہو سکتا تھا کون
طائرِ سدرہ کا ہم آواز ہو سکتا تھا کون

جو لگا دے آگ کوئی نغمہ زن ایسا نہ تھا
تجھ سے پہلے کوئی داؤدِ سخن ایسا نہ تھا

تو نے چھیڑے ہیں وہ نغمے شاعری کے ساز پر
لحنِ داؤدی کو رشک آئے تری آواز پہ

تیرا بربطِ کہکشاں، ناہید ہے تیرا رباب
آسماں تیرا ہے ترے بحرِ تخیل کا حباب

تیرا نغمہ ساحری، تیرا بیاں پیغمبری
تیرے قبضے میں ہے تعلیمِ سخن کی

تیری فکرِ نکتہ رس حسنِ تخیل کا شباب
شعر تیرا معجزہ تیری کتاب

وہ صداقت، وہ حقیقت وہ جمالِ برق پا
زندگی جس کے لئے ہے سرگرمِ تلا

وہ صداقت عکس افگن ہے تری تقریر
وہ حقیقت جلوہ فرما ہے تری تحریر

حسن کے جلووں سے جب محروم ہو جاتے ہیں
کذب کے ظلمت کدوں میں جا کے کھو جاتے ہیں

جب کہ ہوتا ہے شبِ غم میں بلاؤں کا ہجو
جب نگاہیں پھیر لیتے ہیں مہر و مہ و انجم

شعر تیرے جگمگا اٹھتے ہیں اس ظلمات
جس طرح جگنو چمکتے ہیں اندھیری برسات

تو نے دل گرم سینوں کو فروزاں کر
روح کو روشن دماغوں کو چراغاں کر د

تو نے مثالِ شمع ماضی کے سیہ خانے
نور تیرا حال و مستقبل کے کاشانے میں

تیرے گلشن کی بدولت گل بداماں ہم بھی
تیرے نغموں کے اثر سے نغمہ ساماں ہم بھی

ساحر لدھیانوی

# جشنِ غالب

اکیس برس گزرے آزادیِ کامل کو
تب جا کے کہیں ہم کو غالب کا خیال آیا
تربت ہے کہاں اس کی، مدفن ہے کہاں اس کا
اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں خیال آیا

سو سال سے جو تربت چادر کو ترستی تھی
اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے
اُردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کھلتا
یہ جشن، یہ ہنگامہ، خدمت ہے کہ سازش ہے

جن شہروں میں گونجی تھی غالب کی نوا برسوں
ان شہروں میں اب اُردو بے نام و نشاں ٹھہری
آزادیِ کامل کا اعلان ہوا جس دن
اس ملک کی نظروں میں غدار زباں ٹھہری

جس عہدِ سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی
اس عہدِ سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہو؟
غالب جسے کہتے ہیں اُردو ہی کا شاعر تھا
اُردو پہ ستم ڈھا کر غالب پہ کرم کیوں ہو؟

یہ جشن، یہ ہنگامے، دلچسپ کھلونے ہیں
کچھ لوگوں کی کوشش ہے، کچھ لوگ بہل جائیں
جو وعدۂ فردا پر اب ٹل نہیں سکتے ہیں
ممکن ہے کہ کچھ عرصہ اس جشن پہ ٹل جائیں

یہ جشن مبارک ہو، پر یہ بھی صداقت ہے
ہم لوگ حقیقت کے احساس سے عاری ہیں
گاندھی ہو کہ غالب ہو، انصاف کی نظروں میں
ہم دونوں کے قاتل ہیں، دونوں کے پجاری ہیں

رتنی پٹیالوی

# غزل

ترا غم اگر جہاں میں مرا غمگسار ہوتا
غمِ ناگوار تک بھی مجھے سازگار ہوتا

وہ جو تجھ کو ڈھونڈتے ہیں انہیں کون ڈھونڈتا پھر
ترا جلوۂ فسوں گر اگر آشکار ہوتا

میرے دل پہ چھا نہ جاتا جو کوئی بہار بن کر
میری چشم ہی نظر میں گلِ تر بھی خار ہوتا

ہمیں حسرت آج تک ہے بلندیٔ دار پر
غمِ عشق کا خلش سے کہیں ہمکنار ہوتا

ترے اعتبار پر ہم یونہی تیری راہ تکتے
ہمیں اپنی زندگی پر اگر اعتبار ہوتا

جو نظر تلاش کرتی وہ کہیں ضرور ملتے
وہ کبھی ضرور آتے اگر انتظار ہوتا

مجھے کیا خیال گزرا شبِ غم جب آ گئے وہ
ابھی کچھ دن اور ان کا یونہی انتظار ہوتا

اثر اس قدر تو ہوتا میری سرگزشتِ غم میں
جو میرا فسانہ سنتا وہی اشکبار ہوتا

نہ قرارِ دل کا جاتا نہ سکونِ جاں کو روتے
نہ کسی سے آنکھ لڑتی نہ کسی سے پیار ہوتا

تجھے دیکھ کر برابر تجھے دیکھتے ہی رہتے
ہمیں اپنی بے خودی پر اگر اختیار ہوتا

ترے غم میں دل جو ملتا تو مزے کی بات ہوتی
تیری یاد سے گزر کر تیری یادگار ہوتا

کبھی دردِ لا دوا سے یونہی اے رتنی تڑپتے
یونہی کچھ قرار سامانِ دلِ بے قرار ہوتا

نو بہار صابر

# غزل

ظلمتِ شب سے اُلجھنا ہے سحر ہونے تک
سر کو ٹکرانا ہے دیوار میں در ہونے تک

آپ کہ تو لطفِ سراپا ہے تو کیا ذکر کریں
دل پہ کیا گزری ہے آہوں میں اثر ہونے تک

اب تو اِس پھول کی نکہت سے مہکتی ہے حیات
زخمِ دل زخم تھا تہذیبِ نظر ہونے تک

دل ہی جلنے دو شبِ غم جو نہیں کوئی چراغ
کچھ اُجالا تو رہے گھر میں سحر ہونے تک

اب پیام آتا ہے اُن کا نہ سلام آتا ہے
تھے یہ سب لُطف مرے تیرِ نظر ہونے تک

خونِ دل ارضِ گلستاں کو دیئے جا صابر
کانٹے کانٹے کو حریفِ گلِ تر ہونے تک

---

نو بہار صابر

# رُباعیات

یہ طرفگیٔ فکرِ جواں کیا کہنا
یہ چاشنیٔ لطفِ زباں کیا کہنا
ہیں اور بھی شاعر بہت اچھے لیکن
غالب ترا اندازِ بیاں کیا کہنا

زہرابِ غمِ دہر پیا ہنس ہنس کر
ہر زخمِ تمنا کو سیا ہنس ہنس کر
جُز بندِ الم اور نہیں قیدِ حیات
یہ سوچ کے غم میں بھی جیا ہنس ہنس کر

ہے سب سے جُدا رنگِ سخن غالب کا
یکتائے جہاں ہے بانکپن غالب کا
موضوعِ سخن، حُسنِ زباں، طرزِ ادا
ہر طور سے منفرد ہے فن غالب کا

دُبدا یہ رہی عمر بسر ہونے تک
مِٹ جائیں نہ آہوں میں اثر ہونے تک
اِک شمع تھی غالب کیلئے زیست کہ جو
ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

الہام کی تصویر گری لگتا ہے
غالب کا ہر اک شعر وحی لگتا ہے
کرتا ہے جب اسرارِ تصوف کے بیاں
یہ رندِ خرابات ولی لگتا ہے

دی آب جو انوارِ نظر سے تُو نے
ذرّے کو بڑھا دیا گہر سے تُو نے
اُردو کا چمن کیوں نہ ہو رشکِ فردوس
سینچا ہے اسے خونِ جگر سے تُو نے

ملحد نہ مسلمان کہا غالب نے
انسان کو انسان کہا غالب نے
جس کفر سے ہو عظمتِ آدم کی نمود
اُس کفر کو ایمان کہا غالب نے

اس شان سے انجمن میں آیا غالب
ہر ذہن پہ ہر قلب پہ چھایا غالب
خورشیدِ جہاں تاب کی صورت [illegible]
دُنیائے سخن میں جگمگایا غالب

# غزل

صابر ابوہری ایم اے

کیا کشش اللہ ری دنیائے آب و گل میں ہے
تا ابد جینے کی خواہش ہر بشر کے دل میں ہے

بیت جائے کیا خدا جانے جہانِ شوق پر
وہ تو کہیئے لیلیٔ حسنِ ازل محمل میں ہے

کچھ ہمیں سمجھے نہیں روئے تاباں کو ترے
ذکر تیرے حسن کا کہنے کو ہر محفل میں ہے

کاش یہ کھل جائے تجھ پر اے اسیرِ آب و گل
اک سرورِ بیکراں تسخیرِ آب و گل میں ہے

سوچ کر اے عقل کرنا عزمِ بحرِ عشق کا
ایک طوفانِ بلا ہر موجۂ ساحل میں ہے

کوئی محرم ہی نہیں جب رازہائے عشق کا
ہم کسی کو کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

عشق نے طے کر لیے ہفت آسماں مدت ہوئی
عقلِ ناداں گم ابھی تک جادۂ منزل میں ہے

رہزنِ ہوش و خرد ہے جلوہ گاہِ حسنِ ناز
خود سے بیگانہ ہے صابرؔ! جو بھی اس محفل میں ہے

ماہر القادری

# غالبؔ

غزل کو نیا پیرہن دینے والے  تصوّر کو اِک انجمن دینے والے
حسینوں کو ذوقِ سخن دینے والے  غزالوں کو مشکِ ختن دینے والے
رُخِ شاعری کو پھبن دینے والے  زباں کو حسیں بانکپن دینے والے
تخیّل کی روندی ہوئی وادیوں کو  گل و لالہ و نسترن دینے والے
زمینِ سخن پر ہے احسان تیرا  بیاباں کو رنگِ چمن دینے والے
نئے طرز سے زلفِ شعر و سخن کو  لچک دینے والے شکن دینے والے

تو شاہنشہِ مُلکِ شعر و سخن ہے
ہمیں دولتِ فکر و فن دینے والے

○

گوپال متل

جو شعارِ لب ہے موجِ نو بہارِ نغمہ ہے  خامشی بھی آپ کی آئینہ دارِ نغمہ ہے
گوش اک مدت سے محرومِ سماعت ہے مگر  دِل عجب ناداں ہے اب تک اعتبارِ نغمہ ہے
فرق یہ ہے نطق کے سانچے میں ڈھل سکتا نہیں  ورنہ جو آنسو ہے دُرِ شاہوارِ نغمہ ہے
منکرِ سازِ مسرت ہوں تو کافر ہوں مگر  ہم نفس مضرابِ غم پر انحصارِ نغمہ ہے
اے کہ شکوہ تھا تجھے سنگیں مزاجی کا مری  دیکھ اِس پتھر میں بھی موجِ شرارِ نغمہ ہے

رام رتن مضطر

# نذرِ نیاز

رات دن مجھ کو تماشا چاہیئے
عرش سے تا فرش جلوا چاہیئے

بے طلب دے تو مزا ہے اور بھی
ورنہ ساقی سے تقاضا چاہیئے

مَیں تو جان و دِل سے ہُوں تُم پر فدا
تُم اگر چاہو تو پھر کیا چاہیئے

دیکھیئے آتا ہے کب پیغامِ مرگ
کوئی دِن اب اور دیکھا چاہیئے

دیکھنے کی جب کوئی صورت نہ ہو
دیکھنے والوں کو دیکھا چاہیئے

زندگی میں کامیابی کے لئے
اپنی طاقت پر بھروسا چاہیئے

سجدہ کرنا ہے جبینِ شوق کو
تُو نہیں تو کوئی تجھ سا چاہیئے

وُہ خدا کو بھی جو خاطر میں نہ لائے
بے نیازی اس کی دیکھا چاہیئے

دین و دُنیا مَیں نے سب چھوڑے مگر
مجھ کو تُو ہی اِک اکیلا چاہیئے

پھُول چننے چاہے چُن لیکن ترا
خار سے دامن نہ اُلجھا چاہیئے

پردہ کرنا عشق کی توہین ہے
حُسن کو پردہ نہ کرنا چاہیئے

جذبۂ دِل مضطر فقط کافی نہیں
کُچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

ڈاکٹر اجمل اجملی

غالب وہ برگزیدۂ اربابِ افتخار
غالب وہ نازشِ چمنستانِ روزگار
غالب سخن شناس، سخنور، سخن شعار
وہ جس کے ایک شعر پہ سو جنتیں نثار
جانِ نسیمِ صبح تھا، رنگِ گلاب تھا
تارے تھے ارد گرد، وہ اک ماہتاب تھا

وہ طنز، وہ خطاب، وہ اشعار، وہ سخن
سانسوں کی وہ نسیم، وہ احساس کی جلن
اُف وہ نگاہِ فن سے نکلتی ہوئی کرن
اللہ رے وہ زورِ طبیعت، وہ بانکپن
خوگر ہوا جو درد سے درماں بنا دیا
جو مشکلیں پڑیں، انہیں آساں بنا دیا

اشعار کی زباں میں انساں کے تجربات
غنچوں کے پیچ و خم میں نہاں شورشِ حیات
لمحے میں ماہ و سال، تو قطرے میں کائنات
بیگانۂ قیود تھے ان کے تخیلات
اس آنکھ میں معلمِ اول کا نور تھا
اس کا شعور آدمِ نو کا شعور تھا

اس طبعِ پاکباز پہ کیا کیا نہیں پڑی
کوئی خفا ہوا کبھی، روٹھا کبھی کوئی
افلاس، نارسائی و آشفتہ خاطری
یہ زندگی بھی کتنے مزے میں گزار دی
کوزہ ملے تو ساغرِ جم سے غرض نہ تھی
اس کو کسی کے جاہ و حشم سے غرض نہ تھی

ہر چند کی "مشاہدۂ حق کی گفتگو"
لیکن نہ چھوٹا ہاتھ سے دامانِ رنگ و بو
پائے بتاں پہ سر جھکا زاہد کے روبرو
پیشِ جنابِ شیخ ہوئی بیعتِ سبو
جامِ شراب اچھال کے تارا بنا دیا
اردو کو اس نے انجمن آرا بنا دیا

## نذرِ غالبؔ

گوردن سنگھ ضیاغر

دل کو بچاؤں میں کہ سنبھالوں جگر کو مَیں
الزام کیوں نہ دوں ترے تیرِ نظر کو مَیں

وہ گھر میں تھے تو گھر کا نظارہ ہی اور تھا
روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو مَیں

پرواز کی سکت ہے نہ راہِ چمن ہے یاد
قیدِ قفس سے چھوٹ کے جاؤں کدھر کو مَیں

دیر و حرم ہیں اہلِ تعیّن کے واسطے
تیری تلاش کے لئے جاؤں کدھر کو مَیں

کس کو غرض جو کوئی بنے میرا راہبر
جب راہ زن خیال کروں راہبر کو مَیں

ہر شعر میں ہے طرزِ اُسی جادو طراز کی
پاتا ہوں اِس کلام میں رنگِ ہنر کو میں

○

منوہر لال دِل

سانس گھٹتی رہی زاری میں لب پر ہونے تک
گردِ غم چھائی رہی آنکھ کے تر ہونے تک

شب غم نالے نے گھر سر پہ اٹھا رکھا تھا
ایک طوفاں کا عالم تھا سحر ہونے تک

لذّتِ دردِ محبت ہمیں معلوم نہ تھی
دل میں پیوست ترا تیرِ نظر ہونے تک

موجۂ بحرِ حوادث کا نہ پوچھو عالم
زیست بیکار تھی ساحل پہ بسر ہونے تک

جان بچ جائے کہیں اب جو اجل آ جائے
جینا دو بھر ہے شبِ غم کی سحر ہونے تک

دھول اڑانے کی بہار اور ہی کچھ ہوتی ہے
ہم نے کی خاک بسر خاک بسر ہونے تک

شمع جلتی رہی جل جل کے جلانے کے لئے
آ کے جلتے رہے پروانے سحر ہونے تک

غور سے عالمِ ہستی پہ نظر کی ہم نے
اس میں کچھ بھی تو نہ تھا زیر و زبر ہونے تک

شب کو آئے تھے تو کیا آتے ہی اٹھے اے دلؔ آخر
وہ بیٹھے رہے وہ ہم سے سحر ہونے تک

گیانی گورمکھ سنگھ مسافر

# غالب

سوچ ڈونگی سرلتا ہے بیان دی — حرف سادے گل گوڑھی گیان دی
پھج پاندی تیرے سخناں دی زمین — اکھ ڈھک ڈھک ویکھدی اسمان دی
تیری انگل چھو گئی جس ساز نوں — تان چھڑ پئی اک جہانی شان دی
جوڑیاں تیری کلاداری دے حرف — نکھردی تصویر ہے انسان دی
عالمی قدراں دے سندر گیت کار! — بات تیری بات ہندوستان دی
اگڑدی ایداں منکھتادی قدر — گل نہیں کبول ترے سنمان دی
اے سپیجے کاریگر اک اٹ دی — بے میچویں نہیں ہے ترے دیوان دی
کاویہ تیرا زندگی وچ زندگی — لوڑ نہیں پر تکھ نوں پروان دی

پئے منا ؤ مرن بت، پر غلط ھے
غالب سبند ھے ھبر ھے مرجانے دی

## نذرِ غالب

رام کشن تمنا انبالوی

یہی ہے شغل بس اب جانِ ناتواں کے لئے
فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کے لئے

دیا ہے دل تو مجھے اپنا درد بھی دے دو
کوئی مکین بھی درکار اس مکاں کے لئے

گری تو آہ! اُسی شاخِ گل پہ برق گری
چُنا تھا ہم نے جسے اپنے آشیاں کیلئے

ضیائے داغ سے ہے طور کا گماں دل پر
یہی چراغ مناسب تھا اس مکاں کے لئے

ستم تھے جتنے وہ سب ڈھا دیئے تمنا پر
رہا نہ شغل کوئی دورِ آسماں کے لئے

## نذرِ غالب

حکیم علی احمد فکر عظیم آبادی

دیر و کعبہ ہی میں کیا نورِ خدا ہوتا ہے
جس جگہ دیکھو وہی جلوہ نما ہوتا ہے

اہلِ دنیا سے کوئی لاکھ چھپائے لیکن
عیبِ انساں کا کب حق سے چھپا ہوتا ہے

شمع کی لَو پہ نہ جلتے یہ پتنگے ہرگز
کچھ نہ کچھ سوزِ محبت میں مزا ہوتا ہے

کس جفاکوش کی یاد آئی خدا خیر کرے
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

لوگ برگشتہ ہیں مجھ سے تو نہیں غم اے فکر
جس کا کوئی بھی نہیں ہوتا خدا ہوتا ہے

گوہر سیلانی

# غالب

اے کہ تُو نے پھونک کر اک رُوح جسمِ لفظ میں
ایک اک حساس دل میں درد پیدا کر دیا

اک مزاجِ نو عطا کر کے نگارِ نظم کو
شعر کی دُنیا میں تُو نے حشر برپا کر دیا

تُو نے کیا کیا گُل کھلائے ہیں زمینِ شعر میں
آسماں کے ماہ پاروں تک کو رُسوا کر دیا

تیرے ایک اک حرف نے کھولے ہیں اسرارِ حیات
تیرے ایک اک نقش نے دل میں اُجالا کر دیا

نثر کیا اور نظم کیا دونوں پہ قدرت تھی تجھے
کہہ دیا جو اُس کو اُردوئے معلیٰ کر دیا

پردۂ مینا سے اُٹھی تیرے وہ اک موجِ نور
جس نے ہر رنگِ غمِ ہستی کو پھیکا کر دیا

قرض کی پیتا رہا جی کھول کر جیتا رہا
فاقہ مستی نے بھی تجھ کو دل کا دریا کر دیا

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
المدد المدد موت کو تُو نے مسیحا کر دیا

دیکھئے اب شاعری کے فن میں کیا کرتے ہیں ہم
تو نے تو ہر شعر کو رشکِ ثریا کر دیا

محمد حنیف کوثر

# نذرِ غالب

چھپتا کہاں ہے حُسنِ فراواں نقاب میں
سَو بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں

دِل کو سنبھالنا مجھے دشوار ہو گیا
تم یاد آ گئے جو شبِ ماہتاب میں

دیکھے ہیں میں نے عمرِ دو روزہ کے رنگ رُوپ
لذت گناہ میں ہے ، راحت ثواب میں

سارے جہاں کے درد و الم کو سمیٹ کر
میں نے چھپا لیا دِل خانہ خراب میں

یُوں دسترس میں عشرتِ کونین تھی مگر
تم آ گئے میری نگہِ انتخاب میں

لذت اُٹھا رہا ہُوں اُنہیں چھیڑ چھیڑ کر
کتنا خلوص ہوتا ہے اُن کے عتاب میں

کوثر اُسی سوال پہ نادم ہُوں آج تک
خاموش ہو گئے تھے وُہ جس کے جواب میں

اختر واثق

# غزل

چھپ کے روئے گی بہت تجھ کو قضا میرے بعد
زندگی دے گی ہر اک در پہ صدا میرے بعد
اس طرح عام ہُوا ، ذکر تباہی کا مری
پھر ترے شہر میں کوئی نہ گیا ، میرے بعد
میرا افسانہ ادھورا تھا ، ادھورا ہی رہا
اُن کو بھی زیست کا عنوان نہ ملا میرے بعد
اُٹھ گیا بزم سے میں حسرتِ تعمیر لئے
میرے خوابوں کا حسیں شہر بسا میرے بعد
مجھ سے اک حرف بھی سن لینا گوارا نہ کیا
میرا افسانہ زمانے سے سنا ، میرے بعد
کون آواز میں آواز ملائے گا بھلا ،
کس کو دینگے وہ لبِ ناز صدا میرے بعد
وہ میری کاوشِ ناکام کا حاصل تو نہیں
تیری پلکوں پہ جو اک پھول کھلا ، میرے بعد
میں چلا آیا مگر ، مجھ کو خبر ہے واثق
ذکر میرا ہی سرِ بزم رہا ، میرے بعد

جوہر بجادتی

دل گنہگارِ التجا نہ ہوا
سازِ منت کشِ صدا نہ ہوا

جب بصارت ہی کھو چکیں آنکھیں
پھر اُجالا ہوا ہوا نہ ہوا

میری قسمت سے کر دیا منسوب
وہ ستارا جو رُو نما نہ ہوا

میں وہ مجنوں ہوں جس پہ دُنیا کو
سنگ اُٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا

ہاتھ اُٹھے تو تھے دُعا کو مگر
نطق شرمندۂ دُعا نہ ہوا

زندہ رہنے کے جرم میں یا دل پر
ہر نفس ایک تازیانہ ہوا

اب کسے رازداں کرے کوئی
آشنا بھی دل آشنا نہ ہوا

جو ہوا تیرے گیسوؤں کا اسیر
پھر وہ تا زندگی رہا نہ ہوا

بہرِ پرسش وہ روز آتے ہیں
"میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا"

غمگساری کا فیض ہے جوہرؔ
دل جو غم سے گریزپا نہ ہوا

برج لال کوہلی نازاں سرحدی

کیوں اُن کی ہر اک بات پہ گزرے نہ گماں اور
کل ان کا بیاں اور تھا آج ان کا بیاں اور

اک مائلِ تعمیر ہے اک مائلِ تخریب
کھیتوں کا جواں اور ہے کالج کا جواں اور

ارباب سیاست کی قلابازیاں توبہ
کل ان کا نشاں اور تھا آج ان کا نشاں اور

کیا طرفہ تماشا ہے مرے گلخنِ دِل میں
جب آگ بھڑکتی ہے تو اُٹھتا ہے دھواں اور

نغمے میں وہی لے ہے جو نوحے میں ہے لیکن
آوازِ رباب اور ہے آوازِ فغاں اور

ارمان تو تھا خرمنِ تسکیں کی بقا کا
وہ عرضِ تمنا پہ ہوئے شعلہ فشاں اور

اس وقت بشر کی کوئی مجبوریاں دیکھے
جب دل کے دھڑکنے پہ بھی ہوتا ہے گماں اور

کہنے کو تو ہیں ماہ جبیں اور بھی لیکن
اپنا یہ عقیدہ ہے کہاں آپ کہاں اور

اس حرفِ تسلی کا یقیں آئے تو کیوں کر
جب کہتا ہو انسان کا دل اور زباں اور

گو جل گیا لیکن خس و خاشاک ہیں باقی
اک بار نشیمن پہ کرم برقِ تپاں اور

محدود قمر تک نہ رہے کاوشِ انساں
ہیں سینۂ گیتی میں ابھی رازِ نہاں اور

نازاں کی غزل میں بھی ہے اک طرفہ لطافت
ہر چند کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

# دی نیو سورج ٹرانسپورٹ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ

NEW SURAJ

## احمد آباد

(مرگھا واد، پانچ کنواں)

میں بھی

آپ اپنا تجارتی سامان

شمالی ہندوستان میں کہیں بھی پورے اطمینان سے بھیج سکتے ہیں

## نیو سورج ٹرانسپورٹ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ بیرون ہال گیٹ امرتسر

برانچیں:-

| بمبئی | اندور | کانپور | کلکتہ | دہلی | یو۔پی بارڈر | لدھیانہ |
|---|---|---|---|---|---|---|
| 327054-55 | 5073-5036 | 32408 | کو ولولہ سٹریٹ | 229477 | 212041 | 278 |
| تھانہ (بمبئی) 593244 | سرینگر 2997 | جموں توی 8250 | جموں ستی 5842 | پٹھانکوٹ 40 | جالندھر 3660 ,5156 | بٹالہ 60 |
| | | چھہرٹہ 8322 | ویرکا (امرتسر) 45600 | وغیرہ وغیرہ | | |

# شامِ غالب

انجمن ترقی اردو (ہند) امرتسر کے زیرِ اہتمام ۲۰ اپریل کو دفترِ ماہنامہ "جان نثار" امرتسر میں شامِ غالب منائی گئی

★

گیانی گورمکھ سنگھ مسافر ممبر پارلیمنٹ سابق چیف منسٹر پنجاب نے صدارت فرمائی۔ لسان الاعجاز راج کوی میلارام وفا، صابر ابوہری، پورن سنگھ ہنر، رام رتن مضطر، راز سنتوکھ سری اور رام لبھایا ساحر نے اپنی غزلوں سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ صاحبِ صدر نے پنجابی میں غالب پر نظم پڑھی، جو ناظرین صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمائیں گے۔ نشست دو گھنٹے کے بعد کامیابی سے اختتام پذیر ہوئی۔ صاحبِ خانہ نے حاضرین کی چائے سے تواضع کی۔
کرسیوں پر (دائیں سے بائیں) جناب بربنس سنگھ جالی۔ صابر ابوہری۔ گیانی گورمکھ سنگھ مسافر۔ کے آر دھیر۔ میلارام وفا۔ رام رتن مضطر۔ بخشی رام لبھایا ساحر۔
استادہ :- (دائیں سے بائیں) سردار گیان سنگھ گردور۔ راز سنتوکھ سری۔ اوتار سنگھ رئیس۔ رام لال بھنڈاری (مدیر جان نثار، امرتسر)، پورن سنگھ ہنر۔ ہری کشن جوہر۔ جوشش دت شرما۔ سدرشن شرما۔ پریم ناتھ۔ مہندر سنگھ۔

مرزا محمود بیگ

# غالب اور دلّی

حضرت غالب شادی کے دو تین سال بعد تقریباً سولہ
ل کی عمر میں دلّی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے - گو خود
اِس واقعہ کا بیان اِس طرح ایک خط میں لکھتے ہیں: -
"۱۳ برس حوالات میں رہنے کے بعد تاحیات قیدِ با مشقت
سزا ہوئی - بیوی کی شکل میں بیڑیاں پہنائی گئیں - دلّی کو جلے
قرار دیا گیا اور شعر و سخن کی خدمت مشقت تجویز ہوئی"
دلّی میں رہ کر انہوں نے شعر و سخن کی دنیا کو اس طرح مالا
کر دیا کہ آج تک اُستادانِ سخن میں ہی نہیں بلکہ تاجِ ایران
ن میں اس کا شمار ہوتا ہے - عُمر کے ۵۶ برس جو انہوں نے
یہیں گذارے ، ان میں مُغلوں کے آخری تاجدار بادشاہ
بادشاہ کی ملازمت اور پھر اُستادی کی - ۱۸۵۷ء کا انقلاب
ا - عزیزوں کی موت کے رنج اُٹھائے - دوستوں کی پھانسیو
پر کے کھائے اور زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے ترکش اُن
دئے مگر اس کے باوجود اُن کا دل ایک ایسا جہاں نما ہے
ں میں ایک ہی نقش ہمیشہ نظر نہیں آیا - بلکہ اس میں فطرت
عام نقوش باری باری نمایاں ہیں - اس ساز میں بیشمار نغمے
ور ہر نغمہ دل آویز ہے - اُن کے کلام میں سب کچھ ہے - اگر
دل لگی اور شوخی و ظرافت کا سامان چاہتے ہیں ، تو یہاں
آفرینی اور شوخ نگاری کی پھلجھڑیاں ہیں - اگر آپ شباب کی
داستان اور حُسن و عشق کے افسانے سُننا چاہتے ہیں -
سوز و گداز اور نشہ و مستی کی باتیں ہوں گی جس سے افسردہ
میں بھی جان پڑ جائے گی - اور اگر آپ زندگی کے رازہائے
کی پردہ کشائی چاہتے ہیں تو غالب کی پختہ کاری آپ کو
ر فلک بلند پر لے جا کر اس کارگاہِ ہستی کی سیر کرا سکے گی،
ست اس عالم کون و مکان کی ایک ایک چیز صاف نظر آئے
سکے باوجود اس کے کہ دل میں سکون سے رہنا نصیب نہیں
ہوا - آگرہ سے آکر کچھ دن شروع میں گلی قاسم جان میں ایک
مکان میں اپنی سسرال محل سرا نواب الٰہی بخش میں رہے، جہاں
اب شفاخانہ طبیہ ہے - اس کے بعد اس گلی میں ایک مکان
خریدا مگر اسے کلکتہ جانے سے پہلے فروخت کر دیا کیونکہ روپے
کی ضرورت تھی - کلکتہ سے واپس آکر وہ کھاری باولی میں
حویلی نواب عبدالرحمٰن میں رہے - کچھ ہی عرصہ بعد جامع مسجد
کے نیچے میں اور وہاں سے اُٹھے تو پھاٹک حبش خان میں حویلی
مرزا شعبان بیگ میں رہے - یہیں سے شاید ان کو قید میں
رہنا پڑا - قید سے چھوٹے تو احاطہ کالے صاحب میں رہے -
وہاں سے اُٹھے تو بلیماراں میں حکیم محمد حسن خان صاحب کے
مکان میں آ گئے جہاں ۵۷ء میں رہے - ابھی ہنگامہ زوروں
پر تھا کہ شریف منزل بلیماراں میں حکیم محمود خان صاحب کے مکان
میں عارضی طور پر آگئے اور پھر واپس حکیم محمد حسن خان والے مکان
میں آ گئے - ۱۸۶۰ء میں رامپور کے دوسرے سفر سے واپسی
کے بعد مردانہ حصّہ کے لئے وہ مکان لیا جو بلیماراں سے گلی
قاسم جان میں داخل ہوتے ہی اُلٹے ہاتھ کو پڑتا ہے - اور جو
کی مسجد کے برابر ہے - اِسی مکان میں ان کا انتقال ہوا -
مکان کی مصیبت کے باوجود دلی کے سخن سنج احباب
اور اُستادانِ سخن کی محبت اور خود اپنی طبیعت کی روانی
نے کلام کو ترقی دی - مالی پریشانیوں نے دلی کالج کی ملازمت
پر مجبور کیا مگر خودداری پر ملازمت کو قربان کر دیا - انگریزوں
کے وظیفہ خوار تھے ، دوست تھے ، درباریوں میں شرکت کرتے
تھے ، قصیدے پڑھتے تھے ، خلعت پاتے تھے تسلیم مگر
اس کے باوجود صُوبے کے سب سے اعلیٰ حاکم سے ملاقات اور
کالج کی ملازمت سے انکار - یہ استغنا مرزا صاحب کی
خودداری کا ثبوت ہے -

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

۱۸۵۷ء سے پہلے دِلّی میں امن چین تھا - ادب ترقی پر تھا اور ادیبوں کی محفلوں سے دِلّی ایک مسلسل محفلِ مشاعرہ - میاں کالے خان کی حویلی میں ایک دن مرزا غالبؔ - نواب شیفتہ - نواب ضیا الدین خان - حکیم احسن اللہ خان - مولانا نصیر الدین جمع تھے اور حکیم مومن خان مومنؔ کے انتقال پر سب افسوس کر رہے تھے - کسی نے مومنؔ کا ایک شعر پڑھا ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

" مرزا غالبؔ نے اس شعر کی تعریف کرتے ہُوئے کہا " مومنؔ اہلِ دل اور اہلِ نظر تھا - مومن کے مرجانے سے زندگی کا لُطف آدھا رہ گیا اور میرے بعد ..... " اِتنا کہہ کر رُک گئے چونکہ اسی ردیف میں ان کی ایک غزل بھی تھی - احباب نے اصرار کیا تو غالب نے چند شعر سُنائے ؎

حسن غمزے کی کشاکش سے چھُٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اِس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہُوا میرے بعد
غم سے مرتا ہُوں کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

مگر سیلاب بلا نے غالب کے بعد کا انتظار نہیں کیا - اور تھوڑے عرصے بعد کسی ایک کے گھر پر نہیں بلکہ ساری دلی شہر پر ٹوٹ پڑا - بادشاہ کی بادشاہت گئی - امیروں کی امیری خاک میں خاک میں ملی - دِلّی لُٹی - اُس کی اینٹ سے اینٹ بجی - جان و مال و ناموس و مکان و مکیں، آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لُٹ لُٹ گئے -

غالبؔ اِس دِلّی کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں " وہ دلّی نہیں، جس میں اکیاون برس سے مقیم تھا - بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار، اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود قصبہ تھا - اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے "

اپنے دوستوں کو یاد کرتے ہُوئے لکھتے ہیں " میں جس شہر میں رہتا ہوں، اس کا نام دِلّی ہے اور اس محلہ کا نام بلیماراں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست بھی اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا - وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہُوں - سیڑھیوں پر نگاہ کر وہ میر مہدی آئے - وہ میر سرفراز حسین آئے - وہ یوسف مرزا آئے - وہ میرن آئے - وہ یوسف علی خان آئے -

دِلّی کی اس بربادی کو ایک قطعہ میں یوں بیان کرتے ہیں

؎ یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گُل فروش ہے
لُطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں،
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہُوئی
اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مگر اِسی شمع نے رنج و اندوہ کی " اندھیوں میں بجھنا نہیں سیکھا تھا - خود بھی روشن رہی اور اپنے گرد مایوسی کا اندھیرا نہ ہونے دیا - ۱۵ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت چند گورے گوجر بندی کی دیواریں پھاند کر بلیماروں کے محلے میں گھس آئے - مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی - لوگوں کے مال و اسباب کو تو گوروں نے ہاتھ نہ لگایا لیکن مرزا صاحب اور ان کے ہمسایوں میں چند آدمیوں کو پکڑ کر لے گئے - اور کرنل براؤن کے سامنے پیش کر دیا -

کرنل براؤن نے ایک سے پُوچھا " وِل تم کون ہو " اُس نے جواب دیا " مُسلمان " دوسرے سے پُوچھا " وِل تم کون " اُس نے جواب دیا " مسلمان " غالب سے پُوچھا " وِل تم ہو " غالب نے جواب دیا " حضور مسلمان - مگر آدھا - شراب پیتا ہُوں اور سوُر نہیں کھاتا - اِس لئے آدھا مسلمان -

بات ہنسی ہی میں ٹل گئی اور سب ہنس دیے۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

اور بھی بلائیں آئیں اور گزر گئیں۔ سال گزرتے گئے اور مرزا صاحب کچھ عمر کی وجہ سے، کچھ پریشانیوں کی وجہ سے اور کچھ بیماریوں کی بیماریوں کی وجہ سے کمزور اور بوڑھے ہوتے گئے۔ نہ آزاد تھے نہ مقید۔ نہ رنجور نہ تندرست۔ نہ خوش تھے نہ ناخوش۔ اس حالت کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

؎ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

ان مشکلوں کو اپنے اوپر آسان کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ زنان خانے میں چلے گئے۔ بیوی کو ان کی عبادت گزاری کی وجہ سے موسیٰ کی بہن کہا اور کبھی کہا کہ ان کی نمازوں نے گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا دیا۔ کبھی عارف کے بیٹے باقر علی مرزا باقر علی خان کی بیوی —— چنے اور خدا کی کہانی سنا کر ہر چیز چنے کی دال ڈالنے کی وجہ بتاتی۔ کبھی حسین علی کو چھیڑ دیا ——

ایک وقت آیا کہ زندگی سے مایوس ہو گئے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی۔ اب ماشوں پر ہے۔ ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا ہے۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر کیوں جیتا ہوں۔ روح اب میرے جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط۔ کوئی مجمع پسند نہیں آتا۔ کتاب سے نفرت، آدمی سے نفرت، جو کچھ لکھا ہے بلا مبالغہ بیان واقع ہے۔

ع خرم آں روز کزیں۔ منزل ویراں گزرم

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"آگے میں لیٹے لیٹے لکھ لیتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھوں میں رعشہ۔ آنکھوں میں ضعفِ بصر۔ ناتوانی روز افزوں ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا۔ گرانی و گراں جانی۔ رکاب میں پاؤں نہ باگ پر ہاتھ ہے۔ اپنا مصرع چپکے چپکے دہراتا ہوں۔

؎ اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

اب مرگِ ناگہاں کہاں رہی۔ اسباب و آثار جمع ہیں۔ ہائے الٰہی بخش معروف کا کیا مصرع ہے۔

آ ہی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

—— یہ ارمان بھی ایک دن پورا ہو گیا۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء دوپہر ڈھلے اس باکمال کا انتقال ہو گیا۔ دلی دروازے کے باہر نماز جنازہ ہوئی۔ سلطان جی چونسٹھ کھمبے کے متصل خاندان لوہارو کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ اور دلی نے جس پہ اتنے عرصے فخر کیا اسے ابد آباد تک اپنے سینے سے لگا لیا!

# مرزا اسد اللہ خاں غالب

صفحہ ۴۰ سے آگے

وبا کو کیا پوچھتے ہو قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں نہ ہو لسان الغیب اپنے کو لسان الغیب کہہ کر دس برس پہلے فرمایا تھا۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں! ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا اور واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی بعد رفع فساد ہوا۔ کہ سمجھ لیا جائے گا۔ چند شعر

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

•

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

•

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

صابر ابوہری

# غالب کے شاہکار

## تصوف

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے ہے

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

کہہ سکے کون یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

## فلسفۂ حیات

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی - دردِ لا دوا پایا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں اِک عنایت کی نظر ہونے تک

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

پر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

## شوخی

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تُو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

## ضرب الامثال

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی؟ جو جگر کے پار ہوتا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

## شراب

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے جامِ شراب تو دے

## شعر و ادب

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

# لطائفِ غالب

مرزا اسد اللہ غالب جہاں فنِ شعر گوئی میں مسلم الثبوت تسلیم کئے گئے ہیں وہاں ان کی بذلہ سنجی، بدیہہ گوئی اور زندہ دلی میں بھی کسی کو کلام نہیں۔ ان کی زندگی میں جو سیکڑوں ایسے ادبی لطائف نظر پڑتے ہیں کہ سن کر ایک دفعہ تو ضرور انسان کی زبان سے بے اختیار واہ واہ کی صدا نکل جاتی ہے۔

## آپ سودائی ہیں

ایک صحبت میں مرزا غالب میر تقی کی تعریف کر رہے تھے اور ان کے کلام کے محاسن بیان کر رہے تھے۔ حسنِ اتفاق سے شیخ ابراہیم ذوق بھی اس مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ہمیں مرزا صاحب سودا کو میر پر ہر طرح ترجیح ہے۔ مرزا بولے میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا۔ اب راز کھلا کہ آپ تو سودائی ہیں۔

## شراب کی عظمت

شراب کے متعلق ان کی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی نجاست مذمت کی۔ اور یہ دلیل پیش کی کہ شراب خور کی دعا درگاہ الٰہی میں قبول نہیں ہوتی۔ مرزا بولے بھئی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہئے۔ جس کے لئے وہ درگاہ الٰہی میں ہاتھ پھیلاتا پھرے۔

## شیطان کی کوٹھری

مرزا کے مکان میں ایک تنگ و تاریک کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا۔ مرزا ہمیشہ اسی کمرہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دن جبکہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزردہ دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے آئے۔ مرزا صاحب اسی کمرہ میں ایک دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔ مرزا کو رمضان کے مہینہ میں شطرنج کھیلتے دیکھ کر مولانا نے کہا: "ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت پر تردد پیدا ہو گیا ہے" مرزا نے کہا۔ "قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے"

## خدا کو سونپا

جب نواب یوسف علی خاں والئے رام پور کا انتقال ہو گیا تو مرزا صاحب بھی تعزیت کے لئے رام پور تشریف لے گئے۔ ان کے بعد نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ اس زمانے میں نواب کلب علی خاں لیفٹننٹ گورنر سے ملنے کے لئے بریلی جا رہے تھے۔ ان کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے رسماً کہا کہ اچھا مرزا صاحب: "خدا کو سونپا" مرزا صاحب نے سر پیٹ لیا اور کہا کہ "حضور غضب ہے"۔ پوچھا کیوں؟ مرزا نے کہا کہ خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا پھر اب آپ خدا کے سپرد کرتے ہیں۔

## آدھا مسلمان

مرزا غالب کرنل براؤن سے ملنے گئے تو وہی کلاہ پاخ جو پہنا کرتے تھے ان کے سر پر تھی۔ جس کی وجہ سے ایک عجیب و غریب قطع معلوم ہوتی تھی۔ کرنل نے انہیں دیکھ کر کہا: "کہ مرزا صاحب آپ مسلمان ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا: "حضور آدھا مسلمان ہوں"

کرنل صاحب نے یہ سن کر حیرت سے پوچھا یہ کیا بات آدھا مسلمان کیا؟

انہوں نے جواب دیا "حضور آدھا یوں کہ شراب پیتا ہوں سؤر نہیں کھاتا۔"

## ایک نہیں رکھا

رمضان شریف ختم ہونے کے بعد ایک مرتبہ مرزا صاحب قلعہ میں گئے تو بادشاہ نے پوچھا "کہیے مرزا صاحب آپ نے کتنے روزے رکھے؟"

مرزا نے جواب دیا "پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔"

## گدھے نہیں کھاتے

حکیم رضی الدین مرحوم جو دہلی کے ایک نہایت نامی گرامی طبیب تھے۔ مرزا کے بڑے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مگر اتفاق کی بات کہ ان کو آم مرغوب نہیں تھے۔ ایک دن مرزا صاحب کے یہاں پہنچے ہوئے تھے مرزا جی کے پاس بیٹھے تھے۔ آموں کا زمانہ تھا۔ وہاں برآمدے کے سامنے آموں کے کچھ چھلکے پڑے تھے۔ ایک گدھے والا ادھر سے اپنے گدھے لئے ہوئے گزرا۔ گدھے نے آم کے چھلکے سونگھے اور چھوڑ دئے۔ کھائے نہیں۔ حکیم صاحب نے ہنس کر کہا "دیکھو مرزا تم آموں کی بڑی تعریف کرتے ہو آم ایسی چیز ہے کہ اسے گدھے بھی نہیں کھاتے۔"

مرزا نے جواب دیا "جی ہاں۔ بے شک گدھے آم نہیں کھاتے۔"

## حساب برابر ہوا

کبھی کبھی جب مرزا بیٹھے ہوتے تھے اور بے تکلف دوستوں یا شاگردوں کا مجمع ہوتا تھا۔ تو ایسی بے تکلفانہ باتیں کرتے تھے کہ لطف آجاتا تھا۔

ایک دن مرزا بیٹھے ہوئے پلنگ پر دراز تھے۔ اتنے میں میر مہدی مجروح آ پہنچے اور مرزا کے پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا "ارے بھئی تو سید زادہ ہے۔ کیوں پاؤں دابتا ہے۔ ابیکار کیوں مجھے گنہگار کرتا ہے۔" مگر جوشِ عقیدت خلوص اور اعتقاد کی فراوانی میں کون سنتا ہے۔ مجروح نے ملنے اور برابر پاؤں دباتے رہے۔ جب مرزا نے بہت اصرار کیا تو بولے "قبلہ کعبہ آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ آپ اجرت دے دیجئے گا۔" مرزا نے کہا "خیر یہاں تک کوئی مضائقہ نہیں ہے" ... پاؤں داب چکے تو میر مہدی بولے "لائیے حضرت اجرت لو..."

مرزا بولے "واہ بھئی واہ۔ اماں اجرت کیسی۔ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہاری اجرت داب لی۔ دونوں برابر ہوگئے۔"

## خدا کھانا دے گا

ایک بار انہیں جتنی رقم ملی۔ اس کی شراب خرید لی۔ جب وہ گھر پہنچے تو بیوی ناراض ہوئی کہ گھر میں کھانے کو اناج کا دانہ نہیں اور یہاں ساری رقم شراب پر خرچ کر دی گئی ہے۔ غالب فوراً بولے "قرآن شریف میں خدا نے ہر کسی کو کھانا دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن شراب کا نہیں۔ لہٰذا میں نے شراب خرید لی ہے۔ تمہیں کھانا دے گا۔"

## بھوتوں کا ڈیرہ

غالب کو بھوتوں اور توہمات سے بڑا بیر تھا۔ ایک بار انہوں نے مکان بدلنے کا پلان بنایا۔ جب وہ مکان دیکھنے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ واپس آئے تو بیوی نے کہا "اور تو سب ٹھیک ہے مگر لوگ کہتے ہیں کہ یہ گھر بھوتوں کا ڈیرہ ہے۔" اس پر غالب فوراً بولے "تم سے بڑا بھوت بھی کوئی ہے جو ہو سکتا ہے"۔

## خدا حافظ

ایک بار غالب نے اپنے کسی دوست کو شراب پیش کی۔ جس پر اس نے کہا۔ خدا حافظ۔ غالب نے جواب دیا "میں نے یہ اس خیال سے تمہیں دی ہے کہ تم خود اس کی حفاظت کرو گے۔ اور تم ہو کہ اسے خدا کی تحویل و نگرانی میں دے رہے ہو۔"

## دانے دانے پر مہر

غالب کو بہادر شاہ ظفر سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک جلسہ

مدت تک انہوں نے ان کی خدمت گزاری کی - اور اعزاز پایا - ایک بار وہ دونوں لال قلعہ کے باغ میں ٹہلتے ٹہلتے آگے نکل گئے - پکے ہوئے آم دیکھ کر غالب کی نگاہیں وہیں آم کے درخت پر مرکوز ہو گئیں - بادشاہ کے استفسار پر انہوں نے کہا: "داناؤں کا قول ہے کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ کسی آم پر میرا نام بھی لکھا ہے - یا نہیں - اسی شام غالب کو شاہی باغ کے آموں کا ایک پارسل بھجوا دیا گیا -

## گورے کے بعد کالے کی قید میں

ایک بار غالب کو ایک جھوٹی شکایت کی بنا پر جیل میں بند کر دیا گیا - رہائی کے بعد وہ اپنے دوست کالے خاں کے پاس چلے گئے ان کے ایک بہی خواہ کو ان کی رہائی کا علم ہوا تو وہ مبارکباد دینے چلا گیا - اس پر غالب نے کہا: "کیا میں رہا ہو گیا ہوں؟ پہلے میں گوروں کی قید میں تھا اور اب کالے (کالے خاں) کی قید میں ہوں"

## مؤنث بھی مذکر بھی

ایک موقع پر بحث چھڑ گئی کہ رتھ مذکر ہے یا مؤنث - جب بحث ختم ہونے ہی کو نہ آئی تو غالب نے فوراً کہا: "اگر رتھ کو چلانے والی کوئی عورت ہو تو مؤنث ہے اگر مرد رتھ بان ہو تو اس حالت میں مذکر ہے -"

## قرض کی پیتے تھے

ایک مرتبہ مرزا غالب کے قرض خواہ نے ان پر مقدمہ کر دیا چونکہ جواب دہی کے لئے مرزا صاحب عدالت میں طلب کر لئے گئے - جب مرزا صاحب مفتی صدرالدین آزردہ صدرالصدور دہلی کے روبرو پیش ہوئے تو استغاثہ کے جواب میں انہوں نے یہ شعر پڑھا ~

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب شعر سن کر پھڑک گئے مگر مرزا صاحب کے خلاف ڈگری بھی دے دی - اور مدعی قرض خواہ کو اپنی جیب سے مرزا کا قرضہ بھی ادا کر دیا -

## دھوکے میں نجات

ایک مرتبہ ایک صاحب بھوپال سے دلی میں سیر و تفریح کیلئے آئے - ایک دن مرزا غالب سے ملنے ان کے مکان پر آ گئے - مرزا ان سے خوش خلقی سے ملے لیکن جس وقت وہ ملنے گئے تھے وہ مرزا کے شغل مے و جام کا وقت تھا - لہذا حسب معمول شراب کا شیشہ و گلاس سامنے رکھا تھا - ان صاحب کو خبر نہ تھی - کہ مرزا صاحب کو یہ شوق بھی ہے - اتفاقاً شراب کے شیشے کو انہوں نے ہاتھ میں اٹھا لیا تو کسی نے کہا - جناب یہ شراب ہے -

ان بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا اور فرمانے لگے - "میں نے تو اسے شربت کے دھوکے میں اٹھا لیا تھا"
مرزا صاحب نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا: "زہے نصیب! دھوکے میں نجات ہو گئی -"

## شراب اور جاڑہ

ایک مرتبہ جاڑے کے موسم میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرزا غالب کے مکان پر ان سے ملنے کے لئے آئے - مرزا صاحب شغل مے نوشی میں لگے ہوئے تھے - نواب صاحب کو دیکھ کر ان کی طرف مرزا صاحب نے شراب کا گلاس بڑھا دیا اور کہا لیجئے نا! نواب شیفتہ خاموشی سے دیکھتے رہے -

مرزا صاحب نے پھر خود ہی سکوت توڑتے ہوئے کہا کیا حضرت جاڑے میں بھی نہیں پیتے ؟"

## شراب نہ پی ہو تو کافر

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب مرزا غالب کی پنشن بند تھی - اور پھر جب دربار میں شریک ہونے کی اجازت ہوئی تھی - انہی دنوں منٹگمری میر منشی مفتی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے آئے - تھے کچھ تذکرہ پنشن کا چلا تو مرزا صاحب نے کہا -

"تمام عمر میں اگر ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار - پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے مسلمانوں میں شمار کیا -"

بے۔ ڈی صابر ایم۔ اے

# غالب

مرزا اسد اللہ غالبؔ صرف غالب ہی نہیں بلکہ عالمگیر غالب کہہ سکتے ہیں۔ وہ تمام دنیا پر غالب ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی بڑی شان و شوکت سے بین الاقوامی سطح پر نہ صرف ہندوستان و پاکستان میں بلکہ تمام دنیا میں مختلف ذریعوں سے منائی جا رہی ہے۔

بقول بجنوری مرحوم "کونسا نغمہ ہے جو اس ساز میں موجود نہیں ہے"۔ اُردو شاعری کی دُنیا میں غالبؔ کو جو مقام حاصل ہے اس کی عظمتوں کا اعتراف کرنا اور اسکی شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا تنقیدی شعور کی ایک مسلسل کوشش رہی ہے۔ غالبؔ کی شاعری ایک شدید اندرونی کشمکش اور تصادم کی پیداوار ہے اسی لئے اس کے ایک سے زیادہ رنگ ہیں۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا اس میں اور رنگوں کا افسانہ ہوگا۔ ایک گرہ کھلے گی تو سو گرہیں اور پیدا ہوں گی۔ ایک آئینے کے بعد دوسرا آئینہ ایک تعبیر کے بعد دوسری تعبیر اور ایک پردے کے پیچھے سینکڑوں پردے نظر آئیں گے۔ غالبؔ نے ان پردوں پر اپنی روح کو بے نقاب کیا ہے۔

غالبؔ اُردو شاعری میں ایک نادر مظہر ہیں اُن کی انفرادیت اور عظمت اتنے متضاد پہلوؤں میں اجاگر ہوتی ہے کہ اُن سب کا احاطہ کسی ایک شخص کے کسی ایک مضمون کی محدود بساط میں کرنا مشکل ہے۔ فکر و سخن کی محفل میں ان کا مقام اور منصب سب سے الگ ہی نہیں سب سے نمایاں اور بلندی بھی ہے غالبؔ کی شاعری کا موضوع اُن کی شدید قسم کے ذاتی تاثرات ہیں۔ اُن کی امتیازی خصوصیت ان کا تفکر یعنی ان تاثرات پر اُن کے بے چین اور عمیق ذہن کا ردِ عمل ہے۔

تخیل و جذبات کی ترتیب کا مظہر شاعری ہی ہو سکتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ جذبات کی بدولت ہے۔

شاعری کیا ہے۔ دلی جذبات کا اظہار ہے۔

مرزا غالبؔ کی شاعرانہ شخصیت کسی تعریف و تعا[رف] کی محتاج نہیں۔ اِن کی شاعری کی اہمیت کے اسبا[ب] ظاہر ہیں۔ اِن کے خیالات میں گہرائی۔ جذبات میں خلوص اور اظہار میں کیفیت۔ زندگی کے مخصوص پہلو[ؤں] کی زیادہ مصوری کی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی اور ا[پنے] ماحول کے کئی بڑے بڑے طوفانوں سے گذرے [تھے]۔ غالبؔ کے زمانے میں دہلی کی آخری بہار تھی۔ بہت [سے] لوگ صرف بہار کو دیکھتے رہے غالبؔ کی نگاہوں [میں] کچھ اور بہاریں بھی تھیں۔ اُن کے اندر اُس نظام [حکومت] سے وفاداری کا جذبہ پیدا نہ ہو سکا۔ ان کا باغی[انہ ذہن] ایک مجبور اور معذور درباری کی ذہنیت نہ پید[ا کر] سکا۔ بہادر شاہ ظفر کبھی اُن سے اس طرح خوش رہے جس طرح ذوق سے۔ وہ کسی دربار سے وابس[تہ] نہ ہو سکے۔ دربار سے فائدہ اُٹھانے میں اُنہیں پ[یش] پیش نہ تھا۔ شاہی کے اِس آخری دَور میں وہ [بھی] اِنفرادیت پرست تھے۔ اور انفرادیت پرستی کا [وہ] دَور جو سرمایہ داری میں فروغ پاتا ہے ابھی دُور تھ[ا]

شاہی کے اس دور کو باقی رکھنے کے لئے جس مذہبی جذبے کی مدد مل جاتی تھی - غالبؔ وہ مدد نہ دے سکتے تھے - یہی وجہ تھی کہ تمام عمر دل کی گلی میں کٹی - غالبؔ نے زندگی کے ہر پہلو کا ہر نقطہ نگاہ سے مطالعہ کیا - ان کی شاعری میں تمام عناصر کم و بیش پائے جاتے ہیں جو زندگی کے دائرے میں شامل کئے جا سکتے ہیں - مثلاً شکایتِ زمانہ اخلاق - خودداری - تصوف - فلسفۂ عشق و محبت رندی و زہد - راز و نیاز - سوز و گداز - دردِ محبت - یاس و امید - رشک و حسرت - آہ و فغاں اور قنوطیت ہیں - ہستی اور نیستی کی کشمکش میں پڑے رہتے تھے - دل کی لگی تو ہر وقت کا معاملہ تھا - مگر دل لگی اُن کی زندگی میں شاذ و نادر ہی آئی تھی - تمام عمر مصیبتوں میں کٹی - نامرادی کی مستقل زنجیر دل و دماغ پر چھائی رہتی تھی - بیوی کی موجودگی کو اسیری سمجھتے تھے - کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی - جب ہر خواہش پر دم نکلے تو سوائے خدا سے شکایت اور زمانہ کی رواداری پر ہی قناعت کرنا پڑا - اس زندگی کو خوشحال نہ بنا سکے - کوئی اولاد زندہ نہ رہی - " جتنے بنایا وہ بھی داغِ مفارقت دے گیا - اس عالم میں ایک شاعر کے جذبات جو ہو سکتے ہیں - وہ مرزا غالب جیسے مجدد اور صاحبِ طرز کی زبان سے کہے جا سکتے ہیں - عروض اور بیان کی کتابیں پڑھ کر شاعری کی مہارت حاصل کر لینا اور رعایتوں کو برت بنا کر دنیا سے اپنی اُستادی کا سکہ منوا لینا اور بات ہے لیکن اپنی ذہنی انفرادیت کے اظہار کے لئے کرب کی اس کٹھن راہ سے گذرنا جہاں پہنچ کر قدم قدم پر خود اپنے نقوش کے نامکمل اور ادھورے ہونے کا احساس ہو واقعی وہ درد ہے جس کی تلملاہٹ زندگی کے آخری لمحوں تک نہیں جاتی - غالبؔ کی شاعری کا یہ انسان بیچ بیچ ایک نقشِ فریادی ہے - دیوانِ غالبؔ کے پہلے ہی شعر پر غور کریں ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

شعر کا اصطلاحی مطلب یہ ہے کہ ایران میں رواج تھا کہ فریادی کاغذی لباس پہن کر بادشاہ کے دربار میں آتے تھے اور یہ لباس اس بات کی علامت سمجھا جاتا تھا کہ ایک فریادی فریاد لیکر آیا ہے مگر میرے نزدیک غالبؔ کے اس شعر کا مطلب اور ہے کہ یہ دُنیا ایک کاغذی پیرہن پہنے ہوئے ہے یعنی ہستی کو ناثباتی اور دامِ خیال سمجھا جائے - یہ ہستی ہستی نہیں بلکہ زندگی موجبِ رنج و ملال و آزار کاغذی پیرہن کی طرح عارضی ہے -

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یعنی انسان اپنی اصل ہستی سے خدا ہو کر بنا دی اور فانی دُنیا سے ملحق ہو گیا -

غالبؔ کے یہاں زندگی کے جبر و قہر اور انسان کی مجبوری و معذوری کا جو تذکرہ ہے اُسی بنا پر غالبؔ کو لوگ قنوطی کہتے ہیں مگر یہ نہیں اُس نے زندگی کے جبر و قہر کا احساس رکھتے ہوئے بھی انسان کی عظمت کا ترانہ گایا ہے جس پر برسوں مہر و مہ کی آنکھیں لگی رہی ہیں جو خاک کے پردے سے نکلتا ہے - جب فلک برسوں گردشیں کر لیتا ہے تو گرم سخن ہوتا ہے - اس کے گرد ایک خلق ہے کہ جس کی خاموشی میں بھی ایک عالم نکلتا ہے وہی غالبؔ کا ہیرو ہے - غالبؔ اسی ہستی روحانیت سے بلند ہے جو اپنے خواب و خیال کی مستی کی وجہ سے سنگین حقائق کا احساس نہیں رکھتی انہیں زندگی کی سنگین اور دلدوز حقیقتوں کا پورا احساس تھا - زندگی ان کے نزدیک گمبیر اور منظم شے ہے - اور انسان زندگی کے صحرا میں اُس قطرۂ شبنم کی طرح ہے جو خار و بیابان پر رُکا ہوا ہے - غالبؔ کی شاعری میں قطرۂ شبنم اور خار و بیابان دونوں کا احساس ملتا ہے - انسان اور کائنات کی خلقت اور اس کے آغاز و انجام کے متعلق حکیمانہ ارشادات ملتے ہیں جو ہم کو خرابی کی وہ صورت تو محسوس کروا دیتے ہیں جو روزِ اوّل سے ہماری

تعبیر میں مضمر ہے۔ اُن کی آوازیں وہ بلیغ عارفانہ پندار اور حکیمانہ انداز سے بے نیازی نہیں ہے۔ غالبؔ کی شاعری ناکامیٔ محبت اور محرومی کا سارا احساس لئے ہوئے بھی ہمارے لئے زندگی کی ایک بشارت ہے۔ اپنی شوخ طبعی سے سنگین لمحوں سے گذر جاتے ہیں۔

غالبؔ بہرحال اپنے دور کی پیداوار ہیں لیکن ان کی شاعری کی اپیل آفاقی ہے اور ذہن انسانی کے ایسے سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھاتے ہیں جو ہر دور کیلئے موجبِ کشش ہیں۔ زندگی ایک پل صراط کی طرح ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز میرؔ کے یہاں عاشقی قدرِ اعلےٰ ہے۔ غالبؔ کے یہاں زندگی کیونکہ غالبؔ نے قدیم نظام واخلاق سے بلند ہو کر زندگی کی عظمت کو واضح کیا ہے۔ اقبالؔ کے یہاں آکر صرف زندگی ہی نہیں بلکہ باعمل زندگی قدرِ اعلےٰ بن جاتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر غالبؔ نہ ہوتے تو اقبالؔ بھی نہ ہوتے۔ غالبؔ نے سماجی زندگی کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن اس شخصیت کے اندر کی دنیا کتنی بڑی عظیم اور کتنی دائمی قدروں کی حامل ہے اور کتنی عالمگیر انفرادیت رکھتی ہے اسکا اندازہ ہمیں غالبؔ کی شاعری کے لب ولہجہ سے ہوتا ہے جس کے اشعار پکار پکار کر یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہمیں ایک بڑی شخصیت نے جنم دیا ہے۔

غالبؔ کے بکھرے ہوئے آنسوؤں میں ہمیں بحر حیات کی وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالبؔ کی آہ وفغاں میں بہشتی جنت کی ہواؤں کی سنسناہٹ ہے۔ غالبؔ جب اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے انسانیت کے دل پر ہاتھ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ عالمگیر غالبؔ ہو گیا ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

مگر یہ شعر غالبؔ پر صادق نہ ہوا۔ خدا نے اُس کو رسوا ہونے کی بجائے مقبولِ عام کر دیا۔ مندرجہ ذیل اشعار مرزا غالبؔ کی غزلوں کے بڑے بڑے عناصر پر مبنی ہیں۔

**فلسفۂ عشق ومحبت:۔**

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

**عالمِ یاس:۔**

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

**سوز وگداز:۔**

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

**رندانہ:۔**

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

**غیرت وخودداری:۔**

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

صابرہ

## غالب کے تکیوں پر لکھے ہُوئے اشعار

تھا خواب میں پٹھان کو مجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

رات کے وقت مے پئے ہاتھ میں اک چھری لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یُوں

ذوق آگیا ہے گھر میں چرائے گا سب کلام
اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

جب کہ گھر میں بس ایک مچھر ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مَیں کس طرح سے سوؤں کہ کل سات آٹھ چور
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

یہ ترے مہندی رچے ہاتھ کتنے پیارے ہیں
اری حسینہ ذرا میرے پاؤں داب تو دے

بیگم! ہمیں رُلایا تو تم ڈوب جاؤ گی
لیٹے ہیں ہم شبیہِ طوفاں کئے ہُوئے

نان اُس کی ہے، کباب اُس کے ہیں رانیں اُسکی ہیں
تیری بھیڑیں جس کے گھر شب کو غزل خواں ہوگئیں

لیٹے ہُوئے ہیں ہم ذرا بھر لائیو چلم
مُدت ہوئی ہے حقّہ جاناں پئے ہوئے

## بیگم غالب کے تکیوں پر لکھے ہُوئے اشعار

نیند مجھ کو تو خوب آتی ہے
پر انہیں رات بھر نہیں آتی

ذوق کا مُرغا بہت بد ذوق ہے
صبح سے پہلے جگا دے گا نہیں

ڈھول ڈھپّا مجھ پہ سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
تم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

ڈومنی نے کیا نکما کر دیا
ورنہ غالب آدمی تھے کام کے

پٹخنے کی اے دل اور ہی ترکیب کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے غالب نہیں رہی

دُور سے مومن کے خراٹوں کی آتی ہے صدا
آج پھٹ جائیں گے میرے کان اے میرے خدا

حیف اس چارہ گرہ کپڑے کی قسمت یارب
جس کی قسمت میں ہو غالب کا گریباں ہونا

میری ہی آہوں سے کل شب میری ساڑھی جل گئی
جب بجھانے آئے غالب ان کی داڑھی جل گئی

نشے میں مجھ کو غالب شب کو اکثر پیٹ دیتے ہیں
خدا رکھے بہت سی خوبیاں ہیں پیٹنے والے میں

راجہ مہدی علی خاں

راجہ مہدی علی خاں

# غالب ایک ریسٹوران میں

(ایک اینگلو انڈین حسینہ کے ساتھ)

۱

ہے گال پہ اس تل کے سوا ایک نشاں اور
تم کچھ بھی کہو، ہم کو گذرتا ہے گماں اور
تم کہتی ہو "انگلش میں محبت" کی کرو بات"
آتی نہیں اُردو کے سوا مجھ کو زباں اور
سعدی کی زباں ہی میں کچھ ارشاد کروں میں
ڈر ہے کہ یہ گذرے نہ کہیں تجھ پہ گراں اور
یارب یہ نہ سمجھی ہے نہ سمجھے گی مری بات
ملک اور دے اس کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

۲

کب سے ہم ادھر بیٹھا ہے اے بوائے ادھر آؤ
لیمن کے سوا کچھ بھی ہے کوئی "چیز" یہاں اور؟
لے آؤ "وہ شے" جلدی سے اب ورنہ یہ سُن لو
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور
گر حکم ہو میڈم تو میں منگواؤں مٹن چالیس
کہہ دیتا اگر پاچے "دل" اور "زباں" اور!
"دل" اور "زباں" کر لا فرائی الجے بیرا!
"دل" اور دے اس کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ بل کتنا ہی بڑھ جائے
تو پوائنٹ ہے لیکن یہ کہے جائے کہ ہاں اور

۳

تانگہ بھی مرے پاس ہے تم تم بھی مرے پاس
ہوٹل کے علاوہ تجھے لے جاؤں کہاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو رُک جاتے ہیں تانگے
آفت دیکھ کے پبلک تجھے ہوتی ہے رواں اور
کالوں کو کھٹکا تا ہوں تو آ جاتے ہیں گورے
تم ہو تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

۴

تانگوں پہ ہیں کوڑوں کے نشاں پیٹھ پہ ہیں نیل
ہر روز دکھاتی ہے تو اِک داغِ نہاں اور
تو بھاگ گئی سیج سے گر ہاتھ چھڑا کر
لے آئیں گے بازار سے اِک حورِ جناں اور
اے جانِ تمنا تجھے اِک دُوں گا میں گھونسہ
ہنگامِ شبِ وصل جو کی آہ و فغاں اور

سردار گورنام سنگھ چیف منسٹر پنجاب (دائیں) نے پنجاب یونیورسٹی کے انگلش ڈیپارٹمنٹ کے آڈیٹوریم میں غالب کی تصویر کی نقاب کشائی کی۔ ان کے نزدیک سفری سورج بھان وائس چانسلر کھڑے ہیں۔ اور لسان الاعجاز راج کوی پنڈت میلا رام وفا چیف ایڈیٹر جان نثار (بائیں طرف)
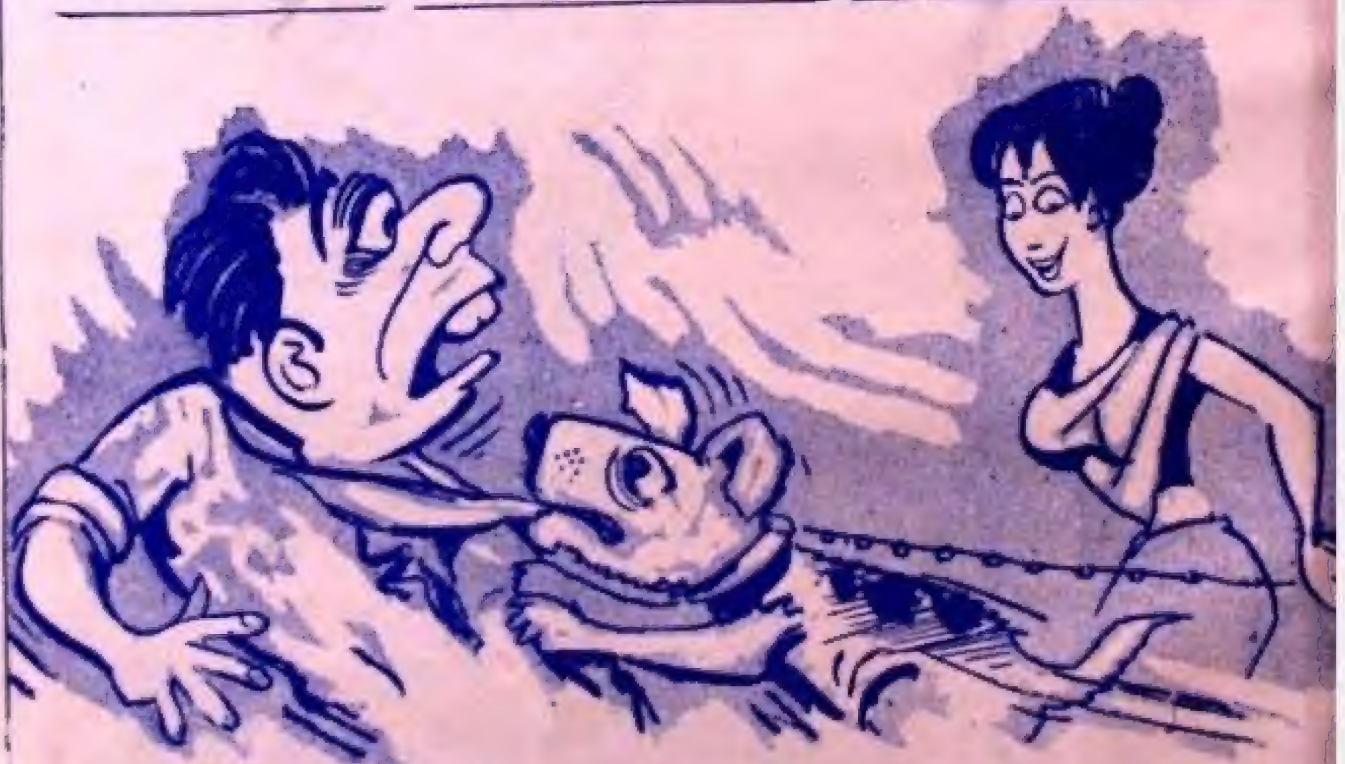
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب ۔ جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

راشٹر پتا مہاتما گاندھی۔ جن کا صد سالہ جنم دن دیش بھر میں منایا جا رہا ہے

ھریانہ
میں
صنعت کاروں کے لئے مواقع
صنعتی ترقی کے لئے موزوں ترین ماحول میں ہریانہ صنعت کاروں کو
متعدد نئی سہولیات پیش کرتا ہے۔
پہلے ہی سے یہاں :-
★ ایک مضبوط صنعتی بنیاد قائم ہے۔
★ دہلی کے گرد و نواح میں فرید آباد۔ بہادر گڑھ اور سونی پت کے ترقی یافتہ اور وسعت پذیر قصبے آباد ہیں۔
★ ٹیکسوں کا مناسب نظام ہے۔
ہریانہ کی طرف سے پیش کی جانے والی دیگر سہولیات ہیں :-
★ زمین، مالی امداد، بجلی، عمارتی سامان، افادیت کا جائزہ، حصّوں میں شرکت وغیرہ۔
★ سٹور پرچیز کے ادارے کی طرف سے ترجیحی سلوک۔
★ دیہات میں منتخبہ پراجیکٹوں کے لئے خصوصی سہولیات۔
اس وقت ذیل کے چار نئے صنعتی مقامات کو نئی صورت دی جا رہی ہے :-
★ جی۔ٹی روڈ پر مورتھل۔ بہال گڑھ کے نزدیک۔
★ دہلی روہتک روڈ پر بہادر گڑھ اور روہتک کے درمیان۔
★ بھوانی اور
★ پنچکولا
تفصیلات کیلئے :-
ڈائریکٹر محکمہ صنعت سے رابطہ قائم کیجئے!
(محکمہ تعلقاتِ عامہ، ہریانہ)

وفا راشدی

# غالب کا اندازِ بیان

علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور اُن کی شاعرانہ عظمت اور ہمہ گیر شخصیت کا اعتراف اس شعر میں کیا ہے۔ ؎

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

اس بات پر سب نقادانِ سخن متفق ہیں۔ کہ غالب کی پروازِ تخیل کو کوئی شاعر نہیں پہنچا۔ لیکن جس چیز نے غالب کو شہرتِ دوام عطا کی اور اُن کی شخصیت کو حیاتِ جاودانی بخشی، وہ ان کا اندازِ بیان ہے۔ اس امر کا خود غالب کو بھی احساس تھا۔ کہ اس کا اظہار بار بار اُنہوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اکثر شعرا نے مقطعوں میں اپنے کمالِ فن اور خوبیٔ سخن کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اس قسم کا ایک شعر داغ کا ذہن میں ابھرتا ہے ؎

نہیں ملتا کسی مضموں سے ہمارا مضموں
طرز اپنا ہے جُدا سب سے جُدا کہتے ہیں

یہاں غالب کا داغ سے یا کسی اور شاعر سے تقابلی مطالعہ مقصود نہیں۔ بلکہ یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اُردو میں اور بھی بہت سے اچھے شاعر ہیں۔ لیکن غالب کا اندازِ بیان سب سے الگ۔ سب سے جُداگانہ ہے۔ آج کی صحبت میں اسی موضوع پر گفتگو کی جائے گی۔

اُردو شاعری ولی، میر، سودا اور درد کے زمانے سے ایک رنگ میں چلی آتی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ رنگینیاں بڑھتی گئیں۔ مضامین و خیالات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ اردو کا دامن گلہائے رنگا رنگ اور گوہر گرانمایہ سے مالا مال ہوتا گیا۔ خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا عہد اُردو شاعری کے لئے تابندہ و درخشاں عہد ثابت ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ذوق، مومن اور غالب نے اپنے اپنے فکر و خیال کے فانوس سے ساری محفلِ سخن کو جگمگا رکھا تھا۔ غالب نے قلعۂ معلّٰی میں بیٹھ کر ایک نئی آواز بلند کی۔ ایک نئی راہ نکالی۔ اور شعر و سخن کی ایک ایسی مشعل روشن کی جس نے مستقبل میں آنے والے کاروانِ سخن کے لئے جادۂ منزل کی نشاندہی کی۔ اُنہوں نے قدما کی روایات کے خلاف بغاوت کی۔ اُردو شاعری میں ہی نہیں اُردو زبان میں بھی ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی۔ اور بقول آل احمد سرور "اُردو غزل میں غالب ایک نیا خیال، نیا گوشۂ فکر، ایک نیا ذہن اور ایک نیا تصور لاتے ہیں"۔ یہ غالب ہی کا اندازِ بیان کا معجزۂ فن تھا۔ کہ اُردو شاعری کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اعجازِ شعر ان کے اندازِ بیان کا مرہونِ منت ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور ایک اور جگہ رقمطراز ہیں۔

"غالب کے تغیرِ شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے۔ اور اس جدت طرازی میں جدتِ تخیل، جدتِ طرزِ ادا، جدتِ استعارات و تشبیہات، جدتِ محاکات اور جدتِ ادا۔ سب محاسنِ شعری میں آ جاتے ہیں"۔

ایک سرور پر ہی اکتفا کیا ہے دوسرے نقاد بھی غالب کے اندازِ بیان کے معترف ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی نے غالب کے اندازِ بیان کو جدت طرازی کسی نے طرزِ ادا کسی نے جدتِ ادا اور کسی نے اسلوبِ بیان کا نام دیا ہے۔ اور خود غالب نے بھی ادائے خاص سے نکتہ سرا ہونے پر فخر کیا ہے۔ ؎

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

امداد و نقد و نظر نے جس بات کو اندازِ بیان سے منسوب کیا ہے وہ دراصل غالب کی وہ جدت طرازی ہے جو زبان و بیان ترکیب، خیال، محاکاتِ معنی تشبیہات و استعارات غرضیکہ تمام لوازمِ شعری کو ایک ادائے خاص سے شاعری میں سمو دی گئی ہے۔ مرزا کے کلام میں کیا نہیں، جامعیت، بلاغت، اختصار، ندرتِ خیال کے ساتھ ساتھ لطافتِ زبان اور شستگیٔ کلام سب کچھ ہے، حیات و کائنات کے تجربات و مشاہدات حسن و عشق کی رنگینیاں و رعنائیاں اور فطرت کی گہرائیاں اُن کی غزل میں پورے تنوع و توانائی کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

غالب نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا — انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا، تخیل میں تنوع اور معانی میں وسعت پیدا کی، اُردو غزل کو ایک نیا اسلوب دیا، اُردو زبان کو ایک نئے آہنگ سے آشنا کیا ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالب نے زندگی کو فقط دیکھا نہیں محض اپنایا نہیں، بلکہ اسے برتا بھی ہے۔ وہ زندگی کی مسرتوں اور نعمتوں سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ اور اس کی محرومیوں اور صعوبتوں سے بھی دوچار رہے۔ اُن کے نزدیک زندگی ایک شمع کی مانند ہے۔ جسے صبح ہونے تک سکون ہو یا طوفان، جلتے رہنا ضروری ہے۔ ؎

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غمِ ہستی کا یہ احساس، حیات و موت کی یہ حقیقت پہلی بار ہمیں غالب کی غزل میں نظر آتی ہے، اُنہوں نے جس طرزِ خاص سے عملی زندگی کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے اس کی مثال اس سے پہلے کسی اور غزل گو شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ اگر انسان کے لئے موت لازمی نہ ہوتی، تو حیات میں دلکشی نہ ہوتی۔ زندگی کے نشاط و انبساط کا لطف حاصل نہ ہوتا، جہانِ کارزار میں فکر و عمل کے بغیر انسانی عظمت کا کوئی قائل نہ ہوتا۔ سو دراصل دُنیا کی ساری رونق اور اس کے ہنگامے مرنے کے لئے جینے یا جینے کے لئے مرنے پر موقوف ہیں ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غالب کی شاعری میں ہمیں نشاط اور حوصلے کی دلکش تصویر بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں داخلی و خارجی کیفیات یکساں ہیں۔ غالب کی زندگی غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے نزدیک غمِ عشق کے بغیر غمِ زندگی خام ہے۔ اُن کے پاس جس شدت سے غمِ عشق کا جذبہ کارفرما ہے۔ اس شدت سے انکارِ حیات بھی غالب ہے۔ وہ انسان ہی کیا جس کے دل میں درد نہ ہو، درد کا مزا غم خوردہ دل ہی پاسکتا ہے، عشق کی بدولت ہی خواہ وہ حقیقی ہو یا مجازی طبیعت زندگی کی اصل لذت سے آشنا ہوسکتی ہے۔ ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

لفظی صنعت گری بھی غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی جدت طرازی کے باعث شعر میں ایک کشش ایک تاثر پیدا ہوجاتا ہے۔

؎ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب صوفی شاعر نہ تھے۔ نہ اُنہیں تصوف سے کوئی لگاؤ تھا۔ لیکن وہ اکثر اپنے اشعار میں صوفیانہ خیال اور مسائلِ تصوف بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے جس کی وجہ سے فلسفۂ تصوف کے بعض اہم نکات غزل کی وسعت کا باعث بن گئے، کہیں کہیں عارفانہ رنگ بھی ہے۔ اور غزل کے مزاج نے اس رنگ کو بھی قبول کیا ہے، اُنہوں نے ایک نئے انداز سے غزل میں مسائلِ تصوف بیان کئے۔ اگر بادہ خوری کے عادی نہ ہوتے تو اُن کے ولی ہونے میں کوئی کلام نہ تھا۔ اندازِ بیان میں ایک جادو ہے۔ ایک سحر کاری ہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سیدھی سادی بات کو اگر سلیقے اور ڈھنگ سے کہا جائے تو نہ وہ نہ صرف معنی خیز بن جاتی ہے، بلکہ دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ غالب کے ہاں بات کا ایک سلیقہ ہے ایک ڈھنگ ہے ایک انداز ہے اس لئے فوراً دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔ ذہنوں پر چھا جاتی ہے۔ اس میں غالب کی ذہانت، ذکاوت، تخیل، خوش طبعی، ظرافت، شگفتگی اور طرزِ ادا کو بڑا دخل ہے۔ اس پر مولانا حالی کا یہ قول سند کا حکم رکھتا ہے۔ ”ایک مضمون اور اس کا ایک معقول سو تکلف اور اس کی سیدھی بات“

مولانا محمد مصطفیٰ

# غزل اور تغزل

شعر سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

حسن کا شیدائی جب گلزار و لالہ زار کے حسینوں کو دیکھتا ہے تو حسن تخیل اسے یہ بتاتا ہے کہ اس خاک کثیف سے ایسے نازک لطیف پھول تو نہیں ہو سکتے، ہو نہ ہو یہ اگلے زمانے کے مہرو شان لالہ رو اور گلرخاں سیمیں بدن جو عالم برزخ سے نقاب خاک کو الٹ کر اس طرح جلوہ نما ہیں اور یہ بھی چند ہیں ورنہ چند در چند تو اپنی خلوت ناز سے جھانکتے تک نہیں اور جب یہ حیثیت گلنائیہ ان کی یہ آن بان ہے تو ہائے اس زندگی میں ان کی کیا نہ کچھ شان ہوگی۔

"سب کہاں" سے کمیت کی کثرت، ظاہر ہوگئی اور "کیا" نے کیفیت حسن کے ناقابل بیان ہونے کو بتا دیا۔

ایک میرے ہندو شاگرد نے اثنائے درس میں یہ کہا کہ اس شعر سے تناسخ کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے، میں نے جواب دیا کہ نہیں اس میں حسن تعلیل و حسن تخیل ہے۔

تناسخ کے معنی ہیں روح کا وقت مقررہ پر ایک جسم حیوانی کو چھوڑ کر دوسرے جسم میں داخل ہونا اور یہ مسلم ہے کہ گل و لالہ از قسم نباتات ہیں نہ کہ از قبیل حیوانات

اگر یہ تناسخ کی نئی اصطلاح بادلیل ہے تو ایک لفظ کا خط منحنی یا مستقیم بن جانا، تبخیر سے پانی کا ہوا ہو جانا اور تکثیف و تبرید سے اولا بن جانا یہ سب تناسخ ہو گا تو محبوب کا محب اور محب کا محبوب ہو جانا بھی تناسخ، بلکہ میں تو علی سبیل تنزل یہ کہتا ہوں کہ انسان کا کئی روپوں میں گشت لگانا [illegible] سیر کر کے گھر واپس آ جانا بھی گر تناسخ ہے تو [illegible] تناسخ کا قربان

جائیے اس تناسخ کے!

شعر نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

خوشا نصیب جو کسی کو محبوب کا قرب و وصال اور مشاہدہ حاصل ہو، دن اس کا عید اور رات اس کی شب برات ہے جتنا بھی ناز وہ کرے بجا ہے کیونکہ زلف پریشاں کی حمائل نے اسے اپنے حصار عافیت میں لے لیا ہے اب اسے ع

ہزاروں صاحب کا پٹ پھر اثر ہووے تو میں جانوں

اس کے خلاف ایک عاشق ہے مہجور، جسے نہ دن کو چین نہ رات کو نیند جس کی زبان حال کا یہ قائل ہے۔

شعر شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

اور

رات ہمسایوں نے اٹھ اٹھ کے دعائیں مانگیں
شور نالہ مرا مدھم نہ ہوا پر نہ ہوا

وہ مانند زلف پیچاں کی طرح پیچ و تاب میں ہے اور دلجمعی

میں نے ایک زمانہ گذرا کہ دیوان حافظ کا مطالعہ کیا تھا اور کسی شارح نے خواجہ حافظ کے اس شعر پر

شعر کہ دہد دست ایں غرض یا رب کہ ہمدستاں شوند
خاطر مجموع ما زلف پریشان شما

حیرت کا اظہار فرمایا کہ زلف پریشاں تو عاشق کی پریشانی خاطر کا باعث ہوتی ہے۔

اس اعتراض کو سن کر مجھے بھی پریشانی ہوئی تھی۔ الحمد…

کہ مرزا کی زبان سے وہ اشکال حل ہوگیا اور دلجمعی نصیب ہوئی

تخ　میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

ایسا بددماغ خدا کی خدائی میں شاید ہی کوئی ہو جو محبت کے زمزموں کا قائل اور عشق کی داستان سے متاثر نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ زمین و آسمان اسی محبت پر قائم ہیں، محبت پاک نہ ہو تو دنیا ویران ہو جائے۔

محبت کا متوالا جب چمن میں جا نکلے گا تو گل کو دیکھ کر رخِ محبوب کی یاد تازہ ہوگی۔ سرو سے کسی کا قد دکھائے گا اور نرگس مثلاً آنکھیں ہیں وہ زار قطار خود روئے گا اور اس کے حال پر

سخ　ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

ہاں، رکھیں وہ شاعر بھی ہے۔ تو اس کا نالہ منظوم بھی ہے۔ موزوں بھی ہے۔ یہ غزل کیا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ ایک طرح کا نالہ ہی تو ہے اس کی اس طرزِ فغاں کو قرباں اور طوطیا بھی اڑا لیتی ہے۔ اور بلبلیں تو صحیح معنی میں اس کی حقیقی جانشین بن جاتی ہیں۔

استعارہ کی زبان میں چمن بزم سخن ہے، بلبلیں فصحا و شعرا ہیں، شعر میں اشارہ ہے کہ دردِ عشق و سوز و گداز تغزل کی جان ہے اور جسے یہ مل گیا بلاغت بھی اس پر نثار اور فصاحت بھی قربان۔

سخ　میں گیا بھی وہاں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

کیا کہنا اس تسلیم و رضا کا۔ کیا کہنا اس محبت والہانہ کا اول تو محبوب کی سرکار میں جانے کی سکت نہیں اور کسی نہ کسی طرح رسائی ہو بھی گئی تو خالی ہاتھ کیو۔۔۔ لئے دیکر اپنے پاس ایک دعائیں رہ گئی تھیں۔ سو وہ بھی سب کی سب درباں کو دے چکا۔ اب تو کوئی ایسی غیر مستعمل دعا بھی نہیں رہی جسے محبوب پر نثار کر سکوں ایسی دعا جس میں کوئی شریک نہ ہوا ایسی دعا جو اپنی اور صرف اپنی کا حصہ ہے۔

"نقد" یہ کہتی ہے کہ عاشق یہاں اشتراک فی المحبت سے پرہیز کا اعلان اور توحیدِ عشق کی تلقین کر رہا ہے۔

ظرافت نے کہا یہ معاملہ تو ایسا ہی ہے جیسا بعض ریاستوں میں امیدوار جب کسی افسر سے ملنا چاہتا ہے۔ تو اردلی ہی کے پاس اس کی جیب جواب دے جاتی ہے اور افسر کے پاس جانے کا منہ نہیں رہتا، متانت نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہے افسر ایسے موقع پر امیدوار کو گالی نہیں دیتے بلکہ وہ تو اپنے غم کا شریک و سہیم ہو جاتا ہے۔

ہاں یہاں عاشق اور بوالہوس کا فرق معلوم ہو گیا۔ کہ بوالہوس تو گالیاں کھا کے "بے مزہ" نہیں ہوتا لیکن عاشق کو وہ مزہ آتا ہے کہ گالیوں کے معاوضہ میں ایسی دعائیں تلاش کرتا ہے جو اب تک کسی کو نہ دی ہوں۔

خواجہ حافظ نے ایسے موقع پر "عفاک اللہ نکو گفتی" کہا لیکن مرزا غالب ایسی مستعمل دعا سے اپنے محبوب کی شان کو بالاتر سمجھتے ہیں۔ اب دیں تو کیا دیں۔ اور کہیں تو کیا اس لئے سرگرداں ہیں کہ ان کی گالیوں کا کیا جواب دیں؟!!

شہ　یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

آنکھوں سے جیحون و سیحون یا گنگ و جمن تو ایران و ہندوستان کے شعرا نے بہائے ہیں لیکن یہ طوفانِ نوح بس غالبؔ ہی کی آنکھوں میں سمایا ہے۔ دوسرے کا اس میں حصہ نہیں۔

کہتے ہیں کہ غالب اگر اسی طرح شد مد سے روتا رہا تو یہ امر یقینی ہے کہ اس کے نالوں سے ایسا طوفان عالمگیر برپا ہوگا۔ کہ تمام دنیا ویران ہو کر رہے گی۔

ایک صاحب نے جو اردو کے ایم اے کے وائوا (تقریری امتحان) میں اس شعر پر مجھ ممتحن کی بات کا جواب دیکر آئے تھے مجھ سے دریافت کیا کہ اس کے نکات؟ اور محاسن؟

میں نے جواب دیا اس میں کم از کم سات سنگھار ہیں ا۔

۱۔ یوں ہی، کیفیت و شدت نالہ و بکا کو ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ گر روتا رہا شرط، استمرار کی اس وجہ سے ہے کہ اول تو یہ آہ و بکا اسے خود ہی ڈبو دے گی۔ ایک مدت تک دل کھول کر رو نہ سکے گا۔ اور بالفرض ایسی ہمت کر گیا اور اتنا سخت جان

نکلا تو یہ امر یقینی ہے کہ دیکھنا۔

۲۔ غالب کا اپنی ذات کو صیغۂ غائب سے تعبیر کرنے میں یہ رازہے کہ شدت محویت کے باعث یہ بھی پتہ نہیں کہ آیا غالب میں ہی ہوں یا کوئی اور۔

۳۔ اہلِ جہاں یہ تخاطب بتا رہا ہے کہ اس کی فریاد اطراف و اکنافِ عالم کا احاطہ کیے ہوتے ہے۔

۵۔ بستیوں سے جہاں کو تعبیر کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ ویرانے تو ویرانے ہی ہیں۔

۶۔ وہ کیا خاک ویران ہوں گے اور غرق کرنے میں یہ خرابی تھی کہ اس کے لئے ہربادی لازم نہیں اور بستی اور ویرانہ متضاد بھی ہیں۔

۷۔ ہو گئیں مستقبل کو ماضی کے صیغہ سے ادا کرنا بوجہ یقین کے ہے کہ آئندہ واقعہ ایسا ہے گویا کہ ہو چکا اور اب بھی شک و شبہ نہیں۔

پروفیسر سید حسن

# نذرِ غالبؔ

("ہوں گل فروش شوخیٔ داغِ کہن ہنوز" ۔ غالبؔ)

غالبؔ ترا کلام ہے جانِ سخن ہنوز
نغموں سے تیرے مست ہے ہر انجمن ہنوز

ثانی ترا زمانہ دہر میں اس کو کوئی ملا
دن رات جستجو میں ہے چرخِ کہن ہنوز

تھا آگرے کا لال تو دہلی کا اک چراغ
ضوفگن ہے تیرے بعد فضائے چمن ہنوز

تیرے سوادِ شعر میں کیفیت ہے سحر ناز کی
چھڑکے ہے جانِ شوق سے مشکِ ختن ہنوز

کیا کیا ہوئی غزل میں نئی جدت طرازیاں
مقبولِ عام و خاص ہے تیرا ہی فن ہنوز

سو سال سے ہے کوششِ تقلید گو بہت
پایا کسی نے بھی نہ ترا بانکپن ہنوز

تیری زمیں میں شعر بھلا کب وہ کہہ سکیں
مشقِ سخن میں خام ہے سیدؔ حسن ہنوز

ڈاکٹر پروفیسر نظام الدین

# غالبؔ کا فلسفۂ حیات

بقول رشید احمد صدیقی "مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا۔ غالبؔ، ہندوستانی زبان اور تاج محل! یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور ہندوستان کے سوا کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے۔ ان تینوں میں ہندوستان کے صوری اور معنوی امتیازات جھلکتے ہیں۔"

حقیقت میں آل احمد سرور کے الفاظ میں "ہندوستانی میں پہلی بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت غالبؔ کی ہے"۔ غالبؔ کی شاعری میں اگرچہ فلسفیانہ مزاج ملتا ہے۔ لیکن اس سے قنوطیت یا رجائیت کا کوئی پہلو خاص طور پر نمایاں نہیں ہوتا۔ بلکہ خوف و رجا، آرزو۔ مسرت و حسرت کی رنگا رنگی جھلکتی رہتی ہے۔ غالبؔ کی شخصیت اس رنگین شخصیت کے مشابہ ہے جو مذہبی اور اخلاقی سہاروں کی بجائے انسانی سہارے کی تلاش و جستجو کرتی رہتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بقول سید وقار عظیم اردو ادب پہلی دفعہ بے سہارے سے اپنی عظمت کے بل بوتے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کا کلام ایک طرف انسانی شخصیت کی پُرپیچ راہوں میں روشنی دکھاتا ہے تو دوسری جانب ماضی پرستی سے روکتا ہے۔ ایک طرف انفرادیت کی تعلیم دیتا ہے تو دوسری جانب زندگی کی تکلیفوں پر کڑھنے اور کراہنے کی بجائے ایک حوصلہ عطا کرتا ہے۔ "غالبؔ نامہ" کے مصنف اکرام بجا فرماتے ہیں کہ غالبؔ کی نظر انسانی زندگی کے ان حقائق پر پڑتی ہے۔ جن کی طرف عام طور سے خیال نہیں کیا جاتا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

مرزا غالبؔ کے نظریہ حیات میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غمِ عشق اور غمِ روزگار کو غمِ حیات کے لئے ناگزیر قرار دیا ہے کیونکہ یہی وہ غم ہے جو زندگی کو اپنے سفرِ نامتناہی منزلوں میں پیش آتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

مرزا غالبؔ انسان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بارِ عشق کو اٹھائے اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے مشکلات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ کیونکہ دنیا میں اور بھی کئی آلام ہیں۔ جن سے انسان کو دوچار ہونا ہے۔ اگرچہ وہ اس امر کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ انسان کی زندگی کا دامن غم والم سے پاک نہیں ہے۔ اور زندگی کا لطف مشکلات سے مقابلے کرنے میں ہے۔ تاہم زندگی کے تلخ تجربوں نے انہیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ دفعِ مشکلات انسان کے بس کی چیز نہیں۔ اور زندگی میں عام طور پر ایسے مواقع آتے رہتے ہیں۔ جہاں انسان کو قضا و قدر کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے ہے

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مرزا غالبؔ زندگی کی تلخیوں کو اس کا جزو لاینفک تصور کرتے ہیں۔ اسی لئے نہ وہ زندگی کے رنج والم اور حزن وملال سے مغلوب ہوتے ہیں۔ نہ ان سے نجات پانے کے لئے ترکِ دنیا کی تلقین کرتے ہیں۔ نہ علائق

دنیا وی سے علیحدگی کا درس دیتے ہیں اور نہ مردم بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ بلکہ وہ زندگی کا احترام کرتے ہیں۔ اور اُن کی نگاہ میں زندگی ایسی نہیں ہے کہ جس سے نفرت کی جائے جو قنوطیت کی بنیاد ہے، بلکہ زندگی کی افادیت و اہمیت کو وہ اس طرح واضح کرتے ہیں۔ ؎

ملتا ہے وقتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

کبھی انسانی زندگی کی عظمت اور قدر و منزلت کو وہ اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ؎

رونقِ ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اور کبھی نظریۂ زندگی کو جو دلی کیفیات کی تابع ہے اور جو زمانے اور ماحول پر منحصر ہے۔ انتہائی غم انگیز طریقے پر بیان کرتے ہیں۔ ؎ جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

غرض یہ کہ غالب کا غم صحیح معنوں میں اس صحت مندانہ کا حزن و ملال ہے۔ جسے دنیا و مافیہا کی ہر چیز عزیز ہے۔ لیکن مسلسل سعی کے باوجود اگر حاصل نہ ہو تو ملال نہیں ہوتا۔ اور انتہائی مایوسیوں میں بھی قنوطیت کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے مصائب و آلام کا استقبال کرتا ہے۔

؎ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

یہ ایک مسلّم امر ہے کہ دنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں، انسان پیدا ہوتا ہے مرنے کے لئے عمارتوں کی تشکیل ہوتی ہے تخریب کے لئے۔ پھول کھلتے ہیں مرجھانے کے لئے غرضیکہ دنیا کی ساری چیزیں وجود میں آتی ہیں فنا ہونے کے لئے۔ پس تعمیر و تخریب حیات و موت بقا و فنا لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں غالب فرماتے ہیں۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

مرزا غالب کے فلسفے کے ارتقا کا سراغ وہاں ملتا ہے جہاں روح کا تعلق خدا کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور جہاں انسان انفرادی زندگی کھو کر حیاتِ ابدی حاصل کرتا ہے۔ اصل میں غالب حیات بعد ممات کے قائل نظر آتے ہیں۔ ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

مرزا کے خیال میں انسان کو اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ غالب زندگی کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کے احساس میں ایک تڑپ تھی۔ لیکن جس طرح سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی بیزاری اور بے یقینی اسی کا نتیجہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔ ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اور اصل میں غالب زندگی اور فلسفے کی تعبیر کو سمجھنے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ اسی لئے ان میں بیزاری، بے اطمینانی اور بے یقینی کے ساتھ شک اور شکست خوردگی کا احساس پیدا ہو گیا۔ اور بقول احتشام حسین "اس انفرادی کرب نے انہیں تشکیک، مزاج اور لاشئیت تک بھی پہنچا دیا۔ اور یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ؎

خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا اور ہم کیا
اک روز کا رونا ہو تو رو کر صبر آئے
ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے

بہر کیف مرزا غالب کے فلسفۂ حیات کی بلندی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ شادی و غم کو اہمیت نہ دیتے ہوئے بھی زندگی کو ضروری سمجھتے ہیں۔

, 1969

Regd. No. P. 473

Registered with Registrar of News Papers No. R.N. 12275/66
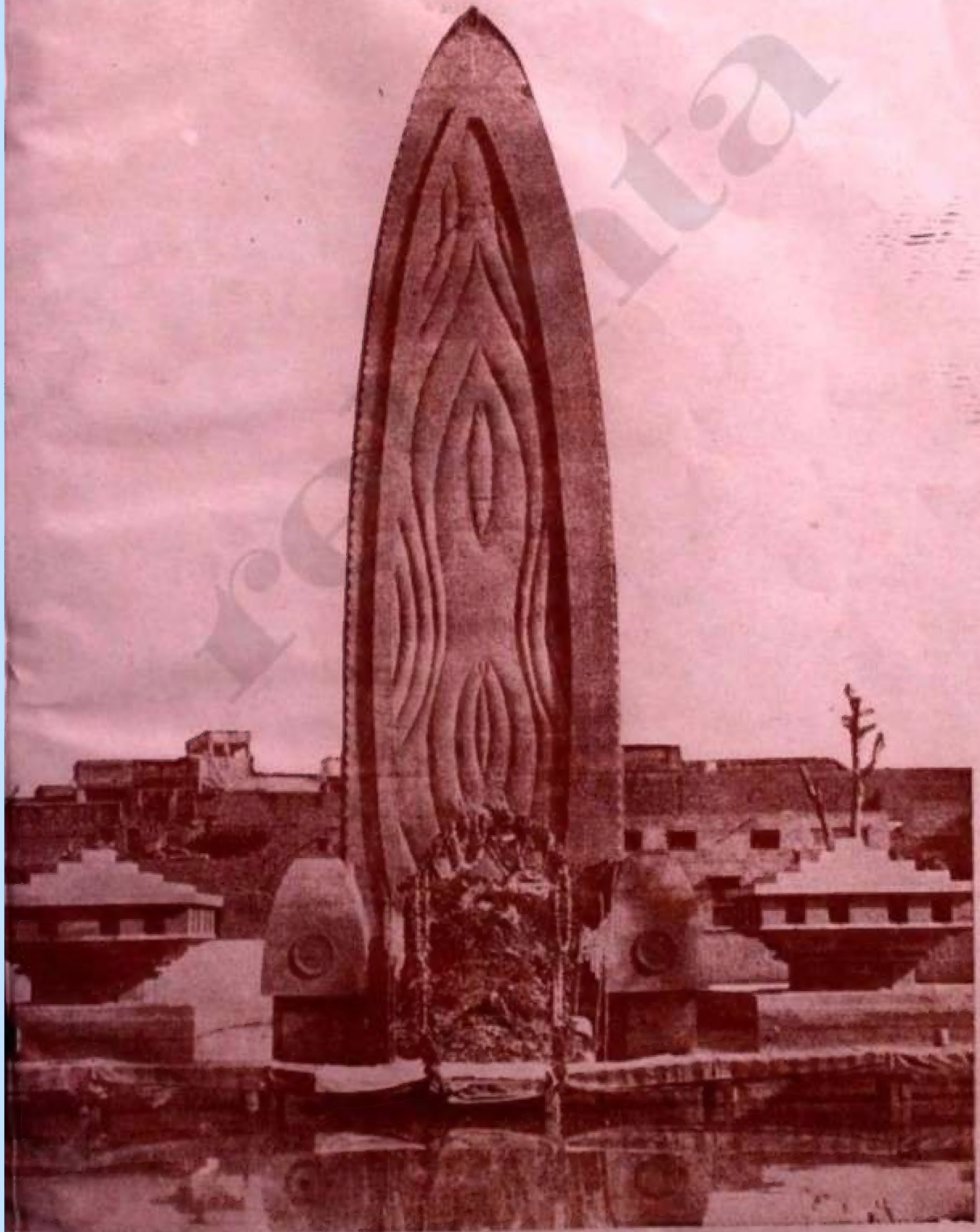

شعلۂ آزادی ——— جلیانوالہ باغ کے ۱۹۱۹ء کے شہیدوں کی یادگ